اقبال

ایک تجزیاتی مطالعہ

شمال احمد

اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ

سجاد احمد

اُردو رائٹرس گلڈ
الہ آباد - ۲۱۱۰۰۳

پہلی اشاعت دسمبر ۱۹۷۴ء
دوسری اشاعت اکتوبر ۱۹۷۷ء

اتکل یونیورسٹی،
برہم پور یونیورسٹی اور
سمبل پور یونیورسٹی
کی منظور شدہ۔

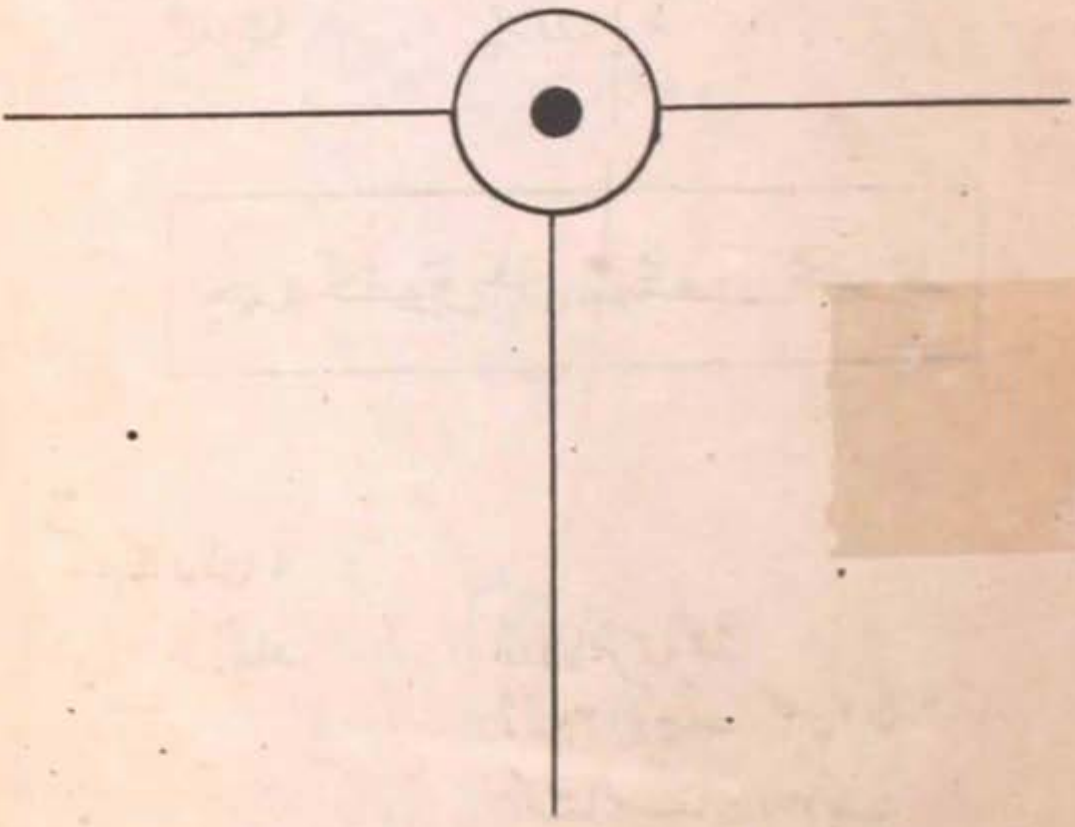

اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ

ناشر : اُردو رائٹرس گلڈ الہ آباد، ۲۱۱۰۰۳
طابع : اسرار کریمی پریس، جانسین گنج۔ الہ آباد
سرِورق : اینگل پرنٹرس، الہ آباد
تعداد : ایک ہزار
تزئین وکتابت : محمد وقار صدیقی۔ ۲۷۲ چک الہ آباد
قیمت : چھ روپیہ

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ

تقسیم کاران :
الہ آباد : اُردو رائٹرس گلڈ
ٹرنر ۲۸، یونینگ کرسچین کالج۔ الہ آباد
" : کتابستان، ۳۰ چک
علی گڈھ : مکتبہ جامعہ۔ شمشاد مارکٹ
پٹنہ : زیور پبلیکیشنز۔ باقر گنج

اُستادِ محترم

پروفیسر سیّد احتشام حسین (مرحوم)

کے

نام

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی

وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے!

اقبال

ترتیب

انتساب	پانچ
حیات ابدی	چھ
فرمودات اقبال	آٹھ
پیش لفظ	نو
اقبال ایک تجزیاتی مطالعہ	سترہ
انتخاب	پچاسی

مجھے اسلام کے خارجی دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی خطرہ ہے تو اندرونی دشمنوں (خود مسلمانوں) سے....

(یروشلم کے موتمر عالم اسلامی میں تقریر)

آج کے تعلیم یافتہ لیڈر خودغرض ہیں اور ذاتی منفعت وعزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے.....

(مکتوب بنام چودھری نیاز علی خاں)

نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو تنگ نظری چھوڑ دو۔ تنگ نظری چھوڑنے سے سب اختلافات مٹ سکتے ہیں.....

(تقریر ۱۹ر نومبر ۱۹۲۶ء)

ہر ہندوستانی مسلمان کا فرض ہے کہ ذات پات کی لعنت کو یکسر ترک کر دے آپ کی ذات صرف اسلام ہے.....

(اقبال نامہ۔ مرتبہ چراغ حسن حسرت ص۸۰)

اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ، ورنہ تمہیں کوئی حق نہیں کہ زندہ رہو

(گفتارِ اقبال ص۱۱۸)

جدوجہد میں ہی زندگی کا راز مضمر ہے.....

(مسلم طلباء کے نام پیغام اکتوبر ۱۹۳۷ء)

(۱)

پیش لفظ

اقبال کیا تھے؟ اقبال نے اردو شاعری کو کیا دیا؟ ان سوالوں میں کئی معنوی اور تخیلی پیچیدگیاں حائل ہیں۔ کتنے دانشوروں نے انھیں حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ کتنے مضامین اور کتنی کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جا رہی ہیں لیکن مسئلہ اور بھی زیادہ الجھتا جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی موافقت اور مخالفت دونوں پر اتنا بہت کچھ لکھا جا چکا ہے کہ اب اور زیادہ لکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ اقبال پرستی یا اقبال شکنی دونوں رویوں میں انتہا پسندی ملتی ہے۔ کسی نے ان کی مجازیت و عقابیت اور اسلامزم پر چوٹیں کیں اور انھیں اسلامی فاشزم پھیلانے کا ملزم قرار دیا اور کسی نے انھیں ان تمام الزامات سے بری کرتے ہوئے آفاقیت سے نوازا اور انسانیت اور

دوستی کا پیغامبر کہا۔

اس روشنی میں ان پر کی گئی تنقیدوں کے مطالعہ کے بعد یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اقبال کا کلام ایک ایسا بحرِ ذخار ہے جس کی تہہ در تہہ لہروں میں متوازی لہروں کی آمیزش ہے۔ انھیں پہچاننا اور پہچان کر ان کا صحیح مقام متعین کرنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ میں نے بھی اقبال کی انھیں پیچیدہ بحثوں اور موشگافیوں کی بنا پر اس وادیٔ پُرخار میں قدم رکھنے کی کبھی جسارت نہیں کی تھی لیکن ادھر چند سال پہلے جانے کون سی ایسی قوت تھی جس نے مجھ میں اقبال کو سمجھنے کی برائت پیدا کی اور یہی جسارت ایک مقالہ کی صورت میں آپ کے سامنے ہے۔ میں کس حد تک اُن کی شاعری اور ان کے خیالات کو سمجھنے میں اور سمجھانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

جہاں تک اقبال کی شاعری کو سمجھنے کا تعلق ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ قاری یا قلمکار بالیدہ ذہن کا مالک ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس میں صالح قدروں کی وہ تمام ترقوتیں موجود ہوں جو ملک اور سماج کی اصلاح و ترقی میں معاون بن سکیں اور انسانیت کا پرچم بلند کر سکیں۔ اس میں کسی طرح کی عصبیت نہ ہو۔ وہ انسانیت پر مکمل ایمان رکھتا ہو اور کسی فردِ واحد سے بھی زبان و مذہب اور طبقہ کی بنیاد پر تعصب اور امتیاز نہ برتتا ہو۔ جب تک قاری یا قلم کار بذاتِ خود صاحبِ کردار نہ ہوگا اس وقت تک وہ

غیر جانبدارانہ طور پر اقبال کے کلام کا تجزیہ نہیں کر سکے گا اور نہ اقبال کی عظمت و آفاقیت پر کوئی حتمی رائے دے سکے گا

اقبال زندگی کا احترام اور انسانی فلاح و بہبود پر ایمان رکھتے تھے۔ آرزو اور تمناؤں کو زندگی کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مسلسل عمل اور خلوص کو مذہب کا لازمی جزو تصور کرتے تھے۔ انھیں انسان کی عظمت و توقیر کا پاس و لحاظ تھا۔ اور "مقصد زندگی" کو انسانی ارتقار کا ایک زینہ مانتے تھے۔ چنانچہ اپنے پیش روؤں کے مقابلے میں زیادہ باوقار، باصلاحیت، منظم، واضح، فلسفۂ وجودیت و بشریت کا تصور رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا مرکزی کردار یہی تصوّر ہے جو کبھی مردِ مومن کی صورت میں اور کبھی "مردِ کامل" کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ جو خودی کے ساتھ مشرق کے فلسفۂ روحانیت اور مغرب کے فلسفۂ وجودیت و مادیت کی تشہیر کرتا ہے۔

اقبال صرف شاعر یا فلسفی نہ تھے۔ بلکہ وہ انسانی زندگی کے بانی و بہزاد بھی تھے۔ ان کی شاعری داغ کی زبان دانی، سرسید کی تعلیمی تحریک، اور حالی کی ادبی اصلاحات کے دائرے میں ارتقا پذیر ہوئی ہے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ان کے اس شعری ارتقار میں مغرب کے افکار و نظریات اور انگریزی شعرار کی رومانویت کا بھی خاصہ حصّہ ہے۔

سرسید کی تحریک اور مشرقی روایات نے ان کے کلام میں وطنیت

کا تصور پیدا کیا جو بہت حد تک حالی اور غالب کی رومانوی فکر کا نتیجہ ہے۔ نیطشے، برگساں اور دوسرے مغربی فلسفیوں کے نظریات نے اُن کی شاعری میں نئی آفاقیت پیدا کی۔ مولانا رومؔ کی فلسفیانہ فکر نے روحانی مسرت اور مارکس کے نقطہ ہائے فکر نے اقتصادی مقاصد کی ضرورت کا احساس دلایا۔

اگر ان کا ابتدائی کلام داغ کی زبان دانی اور تغزل کی یاد دلاتا ہے تو دوسری طرف وطنیت کا تصور حرکت و عمل پر اکساتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے قومیت اور وطنیت کے تصور کو ہمالہ، ہندوستان ہمارا، نیا شوالہ، میرا وطن وہی ہے، اور تصویر درد کے ذریعہ فروغ دیا۔ ان نظموں کے علاوہ گلِ رنگیں، جگنو، چاند کنارِ راوی، شعاعِ امید اور موجِ دریا وغیرہ نظموں میں بھی وہی بے چینی، اضطراب، تجسس اور تلاش کی گرمی محسوس ہوتی ہے۔

انگلینڈ کے زمانۂ قیام میں اُن کی شاعری میں ایک اور نیا موڑ آیا۔ جس نے اُن کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ انھوں نے قومیت کے اس تصور کی مذمت کی جو رنگ و نسل کے امتیازات پیدا کر کے انسانوں کو تنگ نظری پر اکساتی ہے۔ مساوات اور انسانیت کے نام پر اپنے دوغلے پن کا مظاہرہ کرتی ہے اور مادہ پرستی اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس نام نہاد قومیت اور مادیت سے دامن بچا کر اسلامی ملیت کی پناہ گاہ میں خود کو گم

کر دیا۔ ان کی اس تبدیلی کو ہندوستانیوں نے بڑی شدّت کے ساتھ محسوس کیا اور انھیں اسلامی شاعر سمجھنے کی کوشش یا غلطی کی۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی اسلامی ملّیت، انسانیت، مساوات بھائی چارگی، دوستی اور وطنیت کا ہی درس دیتی ہے۔ انکا مقصد اسلام کی اشاعت نہیں تھا بلکہ اسلامی ملکوں کو یوروپ کے پنجۂ استبداد سے باہر نکالنے کا تھا۔ اور مقصد یہ بھی تھا کہ قومیت کے محدود دائرے سے نکل کر انسانیت اور مساوات کے دائرۂ عمل کو وسعت دی جائے تاکہ مغربی نظریات و تصورات کی بیخ کنی کی جا سکے اور ایک ایسے سماج کی تشکیل کی جا سکے جہاں کسی نوع کی تفریق یا عصبیت نہ ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی سلطنتوں پر یوروپ کے ناپاک ارادے اپنا منحوس سایہ ڈال رہے تھے اور مسلمان اقتصادی، سیاسی اور تمدنی اعتبار سے کمزور ہو رہا تھا۔ انھیں اسلامی ملکوں کی زبوں حالی پر افسوس اور اس کے تدارک کی فکر تھی۔ اور اسی جذبہ کے تحت انھوں نے ایشیائی عوام کے سامنے قومیت اور انسانی برادری کا اعلیٰ اور ہمہ گیر تصور پیش کیا۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے اسلامی تعلیمات و رواداری اور اسلام کا شاندار ماضی اور اقوام عالم پر ادبی و سائنسی احسانات کو از سرِ نو تازہ کیا اور مسلمانوں کو ماضی کی وقیع روایات کو قائم رکھنے پر زور دیا۔ قومیت، رنگ و نسل، ذات پات اور اونچ نیچ کے جھگڑوں کو اسلامی روایات کے

منانی قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو مذہبی یک جہتی کی بنیاد پر ایک ہو جانے کی تلقین کی۔

سرار خودی، اور رموز بے خودی میں یہی روح کارفرما ہے شکوہ، فاطمہ، جواب شکوہ، مسجد قرطبہ، ہسپانیہ وغیرہ بھی اسی قبیل کی نظمیں ہیں جو شکست خوردہ مسلمانوں کے جذبات اور ان کے ذہنی ہیجان و اضطراب کو واضح کرتی ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی فلاح و بہبود پر توجہ دی بلکہ تمام ایشیائی قوموں کو مغرب کے سیاسی شعبدہ بازوں کی عیاریوں سے خبردار کیا۔ ان کا پیغام صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ کل نوعِ انسانی کے لئے تھا۔ اگر ایک طرف ترکوں اور عربوں کی پسپائی، آویزش اور ذلت و خستہ حالی کا ماتم کیا ہے تو دوسری طرف ہندوستان کی غلامی، افلاس و تنگ دستی بدگمانی اور آپسی پھوٹ پر افسوس کیا ہے۔ دریوزۂ خلافت اور خضر راہ جیسی نظمیں اس کی واضح مثالیں ہیں۔

مختصر یہ کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ امن و انصاف دوستی، انسانیت، آزادی اور آپسی بھائی چارے کا درس دیا۔ خواہ یہ درس اسلامی تعلیمات کے توسط سے دیا گیا ہو یا مسلمانوں کی شکست خوردگی کے نتیجے میں۔ اقبال ایک عظیم شاعر ٹھہرتے ہیں۔ ان کی آفاقیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان کی ایمان داری

پر شبہہ کیا جا سکتا ہے۔

بہر حال یہ چند سطریں جو مذکور ہوئیں ان سے آپ کس حد تک اتفاق کرتے ہیں اور کس موڑ تک ساتھ دیتے ہیں وہ آپ جانیں لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ میں نے اقبالؔ کو جس نہج سے سمجھنے کی کوشش کی ہے وہ اقبالؔ پرستی یا اقبالؔ شکنی کے دائرے سے بہت حد تک دور ہے۔ پھر بھی جو خامیاں اور کمزوریاں باقی رہ جاتی ہیں انھیں میری نارسائی پر محمول کیا جائے۔

سجاد احمد

الہ آباد

۲؍ دسمبر ۷۴ء ۱۹

(۲)

یہ کتاب پہلی مرتبہ "اُردو رائٹرس گلڈ" (الہ آباد) نے دسمبر ۱۹۷۴ء میں شائع کی تھی۔ ادب کے نکتہ رس حضرات اور دوسرے لوگوں نے جیسی اس کی پذیرائی کی وہ مصنّف کے لئے نہ صرف خوشی کا باعث ہے بلکہ تقویت کا موجب بھی ہے۔ تعریف و تہنیت کے خطوط اور تبصرے کتاب کی مقبولیت اور مفید ہونے کے ثبوتی احساس ہیں۔ کچھ مناسب ترمیم و اضافہ کے بعد یہ دوسرا ایڈیشن پیش ہے کتابت کی غلطیاں اور دوسری کمزوریاں ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماخذات اور اشاریہ کو حذف کر کے چار نئی نظموں کا اضافہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب تنقید کا کوئی بہت بڑا اعلیٰ نمونہ تو پیش نہیں کرتی لیکن اپنی سہل نگاری اور سادہ بیانی کا ایک واضح اور مفرّح نمونہ ضرور ہے۔ مصنّف نے تشریح و مطالب کو گنجلک نہیں بنایا۔ بلکہ طلبہ اور عام پڑھنے والوں کو حواشی اور اشاروں کے ذریعہ مفید اور کار آمد نتائج و دلائل سے باخبر رکھا اور اقبالی فکر کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام لیا۔

یہ کتاب تلاش و تجسّس کا آئینہ ہے۔ جو اقبال کی فکری و ذہنی روّیہ کی مفسرانہ تکمیل و تعمیل میں تعاون کرتی ہے۔

امید ہے مصنّف کو اس کی عرق ریزیوں اور کوششوں کی مناسب داد اور تائید حاصل ہوگی۔

ساحل احمد

الہ آباد ۲۷ اگست ۱۹۷۷ء

۷۸۶

۱

ڈاکٹر سر اقبال کشمیری پنڈتوں کے ایک قدیم اور معزز سپرو خاندان میں بمقام سیالکوٹ جمعہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو پیدا ہوئے۔ یہ خاندان سترھویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوا تھا۔ انھوں نے خود کہا ہے ؎

"برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز است"

آپ کے والد بزرگوار کا نام شیخ نور محمد تھا جو سیالکوٹ کے مشہور تاجر تھے جنھوں نے ان کی پیدائش کے چند روز قبل یہ خواب دیکھا تھا کہ "ایک انتہائی وسیع میدان میں ہزارہا لوگ جمع ہیں۔ فضا میں ایک انتہائی رنگا رنگ پروں والا خوبصورت پرندہ محو پرواز ہے۔ اسکی دلکشی کا یہ عالم ہے کہ لوگ عالم دیوانگی میں اپنے اپنے ہاتھوں کو اٹھائے اسے پکڑنے کی جد و جہد میں مصروف ہیں۔ اس مجمع میں، میں بھی ہوں۔ وہ پرندہ کسی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا۔ آخر ایک دم فضا سے نیچے آیا اور خود بخود میرے دامن میں آ گرا اور میں نے اسے پکڑ لیا۔"

اقبال نے ابتدائی تعلیم دینی مدرسوں میں حاصل کی اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے (۱۸۸۹ء) میں مڈل کا امتحان وظیفہ کے ساتھ پاس کیا۔ اور پھر اسی درسگاہ سے

اٹھارہ

مولانا میر حسنؒ[1] کی رہنمائی میں میٹرک (۱۸۹۳ء) اور ایف۔ اے (۱۸۹۵ء) کے امتحانات امتیاز کے ساتھ پاس کئے۔ تمغہ اور وظیفہ حاصل کیا۔

۱۸۹۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی۔ اے میں داخلہ لیا۔ بی۔ اے کے مضامین میں فلسفہ، انگریزی اور عربی تھی۔ عربی اور انگریزی میں امتیازی نمبر پانے کے صلہ میں دو طلائی تمغے اور وظیفے حاصل کئے۔ وہیں پروفیسر ڈبلیو ٹامس آرنلڈ جیسے معلم سے استفادہ کرنے کا موقعہ ملا۔

اقبالؔ پروفیسر آرنلڈ[2] کا بے حد احترام کرتے تھے اور ان کی انگلستان کی واپسی پر ایک الوداعی نظم "نالۂ فراق" لکھی۔ جس میں انھوں نے ان کی خصلت، خوش خلقی، محبت اور شفقت کی تعریف کی ہے۔

---

[1] شمس العلماء مولوی میر حسن سیالکوٹی نے عربی کی تعلیم مولانا محبوب عالم سیالکوٹی اور مولوی بشیر احمد صاحب سے حاصل کی۔ ۱۶ سال کی عمر سے ہی درس و تدریس کا فریضہ سرانجام دینا شروع کر دیا تھا۔ مشن اسکول کے استاد تھے۔ شروع میں پرائمری درجات کو فارسی، عربی، حساب، جغرافیہ وغیرہ مضامین کا درس دیا۔ پرائمری سے مڈل اور ہائی اسکول کے درجات کو علوم شرقیہ کے علاوہ دوسرے مضامین کا بھی درس دیتے رہے۔ اور جب یہ اسکول کالج بنا تو السنہ شرقیہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آخری عمر میں آنکھ کی بینائی کم ہو جانے کے سبب ۱۹۲۹ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔

[2] آرنلڈ، ۱۸۸۸ء میں علی گڈھ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ یہیں انھوں نے علامہ شبلی سے عربی کی تعلیم حاصل کی اور شبلی نے آرنلڈ سے فرنچ سیکھی۔ ۱۸۹۵ء میں Preaching of Islam نامی کتاب چھپی جس کا اردو ترجمہ عنایت اللہ دہلوی نے کیا۔ ۱۸۹۷ء میں لاہور آئے اور ۷ سال کے قیام کے بعد ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس گئے۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

تو کہاں ہے کلیم ذرۂ سینائے علم
تھی تری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوق رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم

شورِ لیلیٰ کو کہ بازِ آرائش سودا کند
خاک مجنوں را غبار خاطرِ صحرا کند

۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے (فلسفہ) کی سند گورنمنٹ کالج لاہور سے حاصل کی اور پنجاب بھر میں اول آئے۔ ۱۹۰۱ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری کا امتحان بھی پاس کیا۔

ایم۔ اے کی شاندار کامیابی کے بعد اورنٹیل کالج لاہور میں فلسفہ و تاریخ اور سیاسیات مدن کے عارضی لیکچرر مقرر ہوئے۔ اور پھر ۱۹۰۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوئے۔ اسی زمانہ میں آپ نے اقتصادیات اور سیاسیات کے موضوع پر ایک کتاب "علم الاقتصاد" لکھی جو ۱۹۰۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

۱۹۰۵ء میں فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم اور تحقیقات علم کے لئے انگلستان جاتے ہوئے حضرت نظام الدین اولیاؒ[1] کے مزار پر حاضری دی اور "التجائے مسافر" نظم پڑھی

---

[1] نام محمد، القاب محبوب الٰہی، سلطان المشائخ، سلطان اولیا، سلطان السلاطین اور نظام الدین اولیا ہے۔ حضرت کا خاندان بخارا سے ہجرت کرکے ہندوستان آیا اور پہلا مستقر لاہور اور پھر بدایوں ٹھہرا۔ حضرت یہیں بدایوں میں ماہ صفر ۶۳۴ھ مطابق ۱۲۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ بیس سال کی عمر میں تمام علوم دینوی میں کمال پایا۔ حضرت شیخ بابا فرید الدین گنج شکر کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کے حلقۂ مرید

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲ پر)

وہ شمع بارگہہ خاندان مرتضوی ......
رہے گا یاد مثل حرم جس کا آستاں مجھ کو
نقش سے جس کی کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمیں
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو
چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثل نکہت گل
ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لیکے وطن کے نگار خانے سے
شراب علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ جہاں انھوں نے پروفیسر وارڈ، سارلے اور پروفیسر براؤن[1] سے استفادہ کیا اور اپنے قیام انگلستان میں

[1] سر تھامس براؤن (۱۶۸۲-۱۶۰۵ء) اسے مذہبی، سائنسی، سماجی اور دیگر علوم پر گہری دسترس حاصل تھی۔ بیکن کے سائنسی تجربات کا پیرو تھا۔ قدیم و جدید کا ایک بڑا حسین امتزاج اسکی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ ان کے علاوہ اسے جادوگری اور قدیم علوم سے گہری دلچسپی تھی۔ اس کی مشہور تصنیف (URNBURIAL) ہے جو ۱۶۵۸ء میں شائع ہوئی۔

(حاشیہ بقایا صفحہ ۱۹ سے آگے)

میں شامل ہو گئے۔ شعر و سخن سے دلچسپی تھی۔ ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۳ء میں وفات پائی۔ حضرت کی ملفوظات میں فوائد الفواد، نفضل الفوائد، [illegible] المحبین اور سیر الاولیاء مشہور و معروف ہیں۔

میگ ٹیگوٹ اور ڈاکٹر نکلسن جیسے دانشوروں سے ملاقات کی اور ان کے علمی تجربے سے فائدہ اٹھایا۔

مابعد الطبیعات جرمنی کی میونخ یونیورسٹی سے ۱۹۰۷ء میں "ایران کا فلسفہ (Meto Physics of Persia) کے موضوع پر Senechae اور Fraulcim, Wegnart اور Schot خاتون پروفیسروں کی نگرانی میں مقالہ لکھا۔ جن میں ایک پروفیسر آن کی خوبصورت اور لائق بیٹی کو یہ شرف حاصل ہوا۔

۱۹۰۸ء میں تحقیقی مقالہ لندن میں شائع ہوا جس پر لندن کے تمام مستند جریدوں نے توصیفی تبصرے شائع کیے۔

جرمنی سے واپسی کے بعد لندن کے اسکول آف پولیٹکل سائنس میں داخل ہوئے

۱؎ جس نے ہیگل کے تتبع میں اپنے فکری و ذہنی زاویے کو نیا انداز بخشا اور کچھ نئے گوشوں کی نشاندہی کی۔ اس کا یہ فکری تجربہ تلاشِ حسن اور صداقتِ احساس کا پروردہ ہے۔

(George Wilhelm Friedrich Hegel)

ہیگل جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی ۲۷ اگست ۱۷۷۰ء کو پیدا ہوا۔ ۱۸۱۲ء میں اس کی مشہور کتاب LOGIC شائع ہوئی۔ ۱۸۱۶ء میں ہائیڈل برگ میں پروفیسر مقرر ہوا۔ ۱۸۱۹ء میں استعفیٰ دیکر برلن یونیورسٹی چلا گیا جہاں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوا۔ ۱۴ نومبر ۱۸۳۱ء میں وفات پائی۔ اس کی کتابوں میں (Philosophy of Art. Philosophy of Religions اور Philosophy of History بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔

اور ۱۹۰۸ء میں بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

لندن میں انھوں نے اسلام کے موضوع پر کچھ تقریریں کیں جو بہت زیادہ پسند کی گئیں۔ اس کے علاوہ چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ عربی کے پروفیسر رہے۔

Development of Meto Physics کے موضوع پر

ایک کتاب ۱۹۰۸ء میں پیرس میں طبع ہوئی ۱۹۱۳ء میں ایک اور کتاب تاریخ ہند (مڈل کلاسز کے لئے) مرتب کی جو ۱۹۱۴ء میں امرتسر سے چھپی۔ ان کی ایک اور کتاب "مسلم فقہ" پر نامکمل صورت میں ملتی ہے۔

۱۹۰۸ء میں مورخہ ۲۷ر جولائی بروز دوشنبہ لاہور واپس آئے۔ یوروپ کے اس کامیاب سفر پر تبصرہ کرتے ہوئے منشی محمد الدین فوقؔ لکھتے ہیں:۔

"صرف ۳۳۔۳۲ سال کی عمر میں اتنے علمی اعزاز، اس قدر ڈگریاں اور فارسی عربی، سنسکرت کے علاوہ یوروپ کی کئی زبانوں میں ماہر ہونا اور مقبولیت اور شہرت حاصل کرنا معمولی دماغ اور تربیت کا کام نہیں ہے۔ اقبال کی عزت جو عالم متبحر ہونے کی حیثیت سے آجکل ہندوستان اور یوروپ میں ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ آخر آپ ولایت سے ۲۷ر جولائی ۱۹۰۸ء بروز پیر شام کی گاڑی میں لاہور تشریف لائے۔ جہاں ان کے احباب اور دیگر بزرگان لاہور بلا تخصیص مذہب ان کے خیر مقدم کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔ شام کو ان کے اعزاز میں ایک پارٹی منعقد ہوئی" [1]

ولایت سے واپس آنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر کی

---

[1] نیرنگِ خیال اکتوبر ۱۹۳۲ء

حیثیت سے دوبارہ تقرری حاصل کی لیکن ۸ ماہ کی ملازمت کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۸ء کو لاہور میں پریکٹس شروع کی جس کا سلسلہ ۱۹۳۴ء تک قائم رہا۔ یکم جنوری ۱۹۲۳ء میں برٹش گورنمنٹ نے "سر" کا خطاب دیا۔ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں Reconstruction of Religious Thoughts in Islam کے موضوع پر لیکچر دینے کی غرض سے مدراس کا سفر کیا۔ ۱۹۳۵ء میں نواب[1] صاحب بھوپال نے ادبی خدمات کے صلہ میں ۵۰۰ روپیہ ماہانہ وظیفہ تاحیات مقرر کیا۔

یوں تو علامہ کے تعلقات نواب صاحب سے ۱۹۲۷ء سے ہی قائم ہو گئے تھے۔ اور اسی تعلقات کی بنا پر وہ برابر بھوپال تشریف لے جایا کرتے تھے۔ بھوپال میں علامہ کے ملنے والوں میں ممنون حسن خاں کو خاص اہمیت حاصل ہے جو سر راس مسعود[2] کے سکریٹری تھے۔

۱؎ ۹ر ستمبر ۱۸۹۴ء کو پیدا ہوئے۔ تعلیم علی گڑھ میں پائی۔ ۱۹۱۶ء۔۲۲ تک بیگم بھوپال کے معتمد اعلیٰ رہے۔ ۱۹۲۲ء۔۲۶ تک قانون عدل اور خزانہ کے انچارج رہے۔ ۱۹۳۰ء۔۳۵ تک مسلم یونیورسٹی کے چانسلر تھے۔ دو مرتبہ ۱۹۳۱ء۔۳۲ اور ۱۹۴۴ء۔۴۷ میں Chamber of Indian Princes کے چانسلر مقرر ہوئے۔ کرکٹ کے شوقین تھے The Indian
-Young Book 8 Who's Who 1945-46

۲؎ نواب مسعود جنگ بہادر ڈاکٹر سر سید راس مسعود علی گڑھ میں بروز جمعہ ۱۵ر فروری ۱۸۸۹ء کو پیدا ہوئے۔ ۳۰ر جولائی ۱۹۳۷ء کو وفات پائی۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ سید مسعود، سید محمود کے بیٹے تھے۔ علامہ نے لوح تربت کے لئے حسب ذیل رباعی لکھی تھی۔

نہ پیوستم دریں بستاں سرا دل
ز بند این و آن آزادہ رفتم
چو باد صبح گردیدم دمی چند
گلاں را آب و رنگی دادہ رفتم

اقبال نے ان کی وفات پر مرثیہ کہا۔ جو "مسعود مرحوم" کے عنوان سے "ارمغانِ حجاز" میں شامل ہے۔

یہ مہر و مہ یہ ستارے یہ آسمانِ کبود | کسے خبر کہ یہ عالم عدم ہے یا کہ وجود
خیالِ جادہ و منزل فسانہ و افسوں | کہ زندگی ہے سراپا رحیلِ بے مقصود
رہی نہ آہ! زمانے کے ہاتھ سے باقی | وہ یادگارِ کمالاتِ احمد و محمود
الٰہی علم و ہنر مرگِ ناگہاں اس کی | وہ کارواں متاعِ گراں بہا مسعود

اس سلسلے میں رشید احمد صدیقی نے "گنج ہائے گراں مایہ" میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:۔

"زندگی کے آخری عہد میں مرحوم (علامہ اقبالؔ) کا توسل دربار بھوپال سے ہو گیا تھا اس تعلق کے پیدا کرنے میں سر سید راس مسعود مرحوم کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ اقبال کو جو دقتوں کا سامنا تھا اب اس سے نجات ہو گئی تھی دورِ آخر کی بعض مشہور نظمیں مرحوم نے بھوپال ہی میں لکھی۔ بھوپال کا تنہا یہ کارنامہ میرے نزدیک ان کارناموں میں سے ہے جن کو آئندہ آنے والی نسلیں کبھی فراموش نہ کر سکیں گی۔ اگر افراد کی مانند اداروں کی بھی کوئی معیاد ہے تو اسی ایک نیک کام کے صلہ میں بھوپال کی نجات ہے اقبال کو غمِ روزگار سے نجات دلانا میرے نزدیک بہت بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ اقبالؔ کے بعض عقیدت مند سر راس مسعود اور نواب محمد حمید اللہ خاں بالقابہ کی اس فرض شناسی اور علم دوستی کو ان عزیز و گرامی ہستیوں کی اور بہت سی منزلتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔"

قیام بھوپال میں کہی گئی نظموں میں زیادہ تر ضربِ کلیم میں شامل ہیں۔ مثلاً

صبح، مومن، امرائے عرب، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، جمعیت اقوام و مشرق، مسولینی (۲۲، اگست ۱۹۳۵ء)، تصوف اور وحی (شیش محل میں) سلطانی، مقصود، خلافت، نگاہ، امیدا(باض منزل میں) تخلیق کی گئیں۔

غرضیکہ علامہ اقبال بہ یک وقت ایک مفکر، ریفارمر اور شاعر تھے۔ انھوں نے صرف کشمیر اور پنجاب کا ہی نہیں ہندوستان کا بھی نام روشن کیا۔ وہ سیاسی آدمی نہیں تھے۔ انھیں تو قدرت نے ایک مفکر اور ایک شاعر بنا کر دنیا میں بھیجا تھا۔ جناب اعجاز صدیقی لکھتے ہیں[۲]:۔

"ڈاکٹر اقبال کا پنجاب میں پیدا ہو کر ایک ہمہ گیر شاعر و مفکر بن جانا قدرت کا معجزہ ہے۔ وہی قدرت جو موسیٰ علیہ السلام کو "لکنت کے باوجود" اپنا کلیم بنا لیتی ہے اور وہی قدرت جو خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو باوجود "امی" ہونے کے "افصح العالم" ثابت کر دیتی ہے۔

۱؎ بنیٹو مسولینی (Benito Mussolini) ۲۹، جولائی ۱۸۸۳ء کو صوبہ حازلی (اطالیہ) کے ایک معمولی قصبہ میں پیدا ہوا۔ اس کا ابتدائی زمانہ انتہائی تنگدستی میں بسر ہوا۔ کچھ عرصہ "اونتی" (AVANTI) نامی رسالہ کی ادارت کی۔ پہلی جنگ عظیم میں مسولینی اتحادیوں کا ہم نوا رہا۔ لیکن جنگ کے بعد جب اطالیہ میں اشتراکیت کی تحریک پھلنے پھولنے لگی تو اس تحریک کا دشمن ہو گیا۔ چنانچہ اس نے انتہائی سختی کے ساتھ اس اشتراکی تحریک کو کچل کر رکھ دیا اور اس طرح ۱۹۱۹ء میں فاشزم جیسی غیر عوامی تحریک "گودیلے" کا وجود عمل میں آیا۔ اور اس تحریک کا مرکز "میلان" (MILLAN) تھا۔ ۳۰، اکتوبر ۱۹۲۰ء کو اٹلی کا وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اس نے اپنے ملک کی اصلاحات پر خصوصی توجہ دی۔ اور اپنے ان تمام مخالفوں کو چن چن کر قتل کرا دیا اور سخت مخالفت کے باوجود ۲۵، جولائی ۱۹۴۳ء تک اپنے عہدہ پر قائم رہا۔ دوسری جنگ عظیم میں محوری طاقتوں کے خلاف اتحادیوں کو کامیابی ملی تو مسولینی کو بزور طاقت مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور اس طرح ۲۸، اپریل ۱۹۴۵ء کو مسولینی اور اس کے ہمنواؤں کو پھانسی دے دی گئی۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد ۱۶ ص ۲۸-۳۲)

۲؎ شاعر۔ بمبئی، مئی ۱۹۳۸ء ص ۴۴

ورنہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے، پنجاب نے اردو زبان کا کوئی مشہور شاعر کسی عصر میں پیدا نہیں کیا۔ بیشک وہ فصیح الملک مرزا داغ دہلوی[1] کے شاگرد تھے لیکن ان کا کلام داغ مرحوم کا کلام نہ تھا بلکہ انھیں کا سرمایۂ فکر تھا۔"

آل احمد سرور نے علامہ کے ذہنی ارتقار کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:-

"کشمیریوں کی ذہانت اور ذوق جمال کے ساتھ گھریلو ماحول سے انھیں گہری مذہبیت ملی۔ جس میں ایک درویشانہ شان بھی تھی، اپنے استاد میر حسن سے انھوں نے فارسی سیکھی۔ لاہور آکر آرنلڈ کے فیض سے وہ فلسفہ کے اسرار و رموز سے آشنا ہوئے، اور انگریزی کے رومانی شعرار کے مطالعے نے ان کی روح کو متاثر کیا۔ ان کی ابتدائی شاعری میں تلاش، اضطراب، جستجو کی گرمی ہے۔ مگر اس پر ایک رومانی فضا چھائی ہوئی ہے۔ اس رومانیت نے انھیں غالب کی شوخیٔ فکر تک پہنچایا۔ اس نے سرسید کی تحریک اور نئی مشرقیت کے سہارے ان کے یہاں وطن کا ایک عشق بیدار کیا۔ بعد میں فلسفے کی وجہ سے کچھ شاہینی نظر۔ لیکن پھر ارضیت نے اپنا اثر دکھایا اور اس میں اپنے دور کے حقائق کا عرفان پیدا کیا۔ اس کے ارتقاء کی داستان، اس جوئے کوہستان کی داستان ہے جو طفلی میں اتنی پرشور ہے کہ پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے، پھر میدان میں آتی ہے تو اس کی شان و شوکت دیدنی ہے مگر وہ ایک سمندر کی جستجو میں برابر بڑھتی ہی جاتی ہے۔"[2]

علامہ کی شاعری کا آغاز سیالکوٹ میں دوران طالب علمی ہی میں ہوا۔ آپ کی

[1] داغ کی وفات پر کہا گیا مرثیہ بانگ درا میں شامل ہے۔
[2] علی گڈھ میگزین

ستائیس

خداداد شاعرانہ صلاحیتیں گورنمنٹ کالج لاہور سے ظاہر ہوئیں۔ ۱۸۹۶ء میں جب آپ بی۔اے کے طالب علم تھے، آپ کی شہرت لاہور کی گرد و نواح میں پھیل چکی تھی۔ اسی عہد کی ایک رُباعی یہ ہے ؎

سو تدابیر کی اے قوم یہ ہے اک تدبیر — چشم اغیار میں بڑھتی ہے اسی سے توقیر
دُرِّ مطلب ہے اخوت کے صدف میں پنہاں — مل کے دنیا میں رہو مثلِ حروفِ کشمیر

آپ نے داغ سے اصلاح لی اور اس کا اعتراف کیا ہے "شورشِ محشر" میں شائع شدہ غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے۔ جس میں انھوں نے داغ کی شاگردی اختیار کرنے پر فخر کیا ہے ؎

نسیم تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردیٔ داغِ سخنداں کا

ابتدائی کلام میں غزلیں زیادہ ملتی ہیں۔ بانگِ درا جو اُن کا پہلا مجموعہ ہے۔ لیکن اس میں انھوں نے غزلیں کم ہی شامل کی ہیں۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے ایک مشاعرے میں پڑھی گئی۔ غزل سے وہ شعر درج کرتا ہوں جسے سن کر مرزا ارشد گورگانی بے اختیار ہو کر سبحان اللہ کہہ اٹھے تھے، اور فرمایا تھا۔ "میاں اقبال اس عمر میں اور یہ شعر ؎

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مرزا ارشد دہلی میں پیدا ہوئے آپ گورگان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ دہلی کی تباہی کے سبب فیروز پور کی طرف چلے گئے۔ پنجاب کے بہت سے شعراء ان کے تلامذہ کی فہرست میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ لاہور اکثر ان کا آنا جانا رہتا تھا۔ شیخ عبدالقادر نے مخزن میں انکے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اسی غزل کے ایک اور شعر میں لکھنؤ اور دلّی کی کورانہ تقلید سے احتراز کرتے ہوئے کہا تھا ؎

اقبالؔ لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

۱۸۹۹ء سے پہلے آپ کی شاعری قوم کی اصلاح اور وطن پروری کے جذبات سے پُر ہونے لگی ۱۹۰۰ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں "نالہ یتیم" پڑھی۔ اس نظم کے تاثر کا نقشہ عنایت اللہ صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے ؎

"شاعر نے یتیموں کی مصیبتوں کا نقشہ کچھ ایسے درد بھرے الفاظ میں کھینچا تھا کہ سننے والوں کے دل بے چین ہو گئے، اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ جلسہ ختم ہوا تو لوگوں نے شاعر کو گھیر لیا وہ اس سے ہاتھ ملانے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔"

(بقایا حاشیہ صفحہ ۲۷ سے آگے)

متعلق لکھا ہے کہ:-

"طبیعت میں آمد بلا کی تھی۔ مضامین گویا صف بستہ حاضر رہتے تھے۔ قوافی پر عبور کامل تھا۔ بات کرتے کرتے مصرعے اور شعر موزوں ہوتے جاتے تھے۔ کبھی ریل میں سفر میں آتے آتے جلسے کے لئے نظم لکھی جا رہی ہے۔ کبھی بے نظم چلے آئے ہیں اور جلسے میں پہلی شب کو شمع نیم شب جل رہی ہے۔ کبھی جلسے ہی میں اپنی نوبت آنے سے پہلے ایک گھنٹہ بھر کے لئے الگ جا بیٹھتے ہیں اور ایک نظم لکھ لائے ہیں۔"

مرزا نے باقاعدگی سے تصنیف و تالیف میں حصہ نہیں لیا لیکن اس کے باوجود نظم و نثر اگر یکجا کر دیئے جائیں تو کئی جلدیں ہو سکتی ہیں۔ آپ نے نثر میں ناول، مضامین اور نظم میں غزلیں، مراثی، مسدس اور اخلاقی نظمیں کہی ہیں۔ ان کی ایک کتاب "شہنشاہ نامہ" مشہور ہے۔

۱۹۰۱ء میں انجمن کے ہی جلسہ میں "یتیم کا خطاب ہلال عید سے" اور ۱۹۰۴ء میں "ہندوستاں ہمارا" پڑھی۔ اپریل ۱۹۰۱ء میں "ہمالہ" مخزن[1] لاہور میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ہندوستاں ہمارا، یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے اور نیا شوالہ وغیرہ جیسی نظمیں جو وطنی جذبات سے بھری ہوئی تھیں شائع ہوئیں۔ اقبال اگرچہ داغ کے شاگرد تھے لیکن انھوں نے غالب اور حالی کا زیادہ اثر قبول کیا۔ ان کی نظمیں پڑھنے کے بعد یہی محسوس ہوتا ہے کہ انھیں ہندوستان سے بے پناہ محبت اور عقیدت ہے۔ انھیں ہندوستانیوں کے مابین اتحاد و اتفاق، رواداری انسان دوستی کی کمی کا شدید تر احساس ہے۔ "نیا شوالہ" میں فرماتے ہیں ؎

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
واعظ کو بھی سکھایا جنگ و جدل خدا نے

---

[1] مخزن سر شیخ عبدالقادر نے لاہور سے ۱۹۰۱ء میں جاری کیا تھا۔ اس رسالے نے شعر و ادب کی بڑی گراں قدر خدمت کی ہے۔ اس رسالے کے مستقل قلمکاروں میں اقبال، اکبر، ظفر علی خاں، حسرت، داغ، مرزا ہادی، عزیز لکھنوی، شبلی، شرر، نذیر احمد، حالی، سجاد حیدر یلدرم وغیرہ کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

سر شیخ عبدالقادر ۱۸۷۲ء میں لدھیانہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں اپنے والد کے ساتھ لاہور گئے۔ ۱۸۸۲ء میں سنٹرل ماڈرن اسکول میں داخلہ لیا۔ فورمن کرسچین کالج لاہور سے بی۔ اے اوّل درجہ میں پاس کیا۔ بیرسٹر آف لا کی ڈگری حاصل کی۔ اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر اور 'آبزرور' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ وکالت لائل پور میں شروع کی۔ ہائی کورٹ کے جج، پنجاب کونسل کے صدر، حکومت کے وزیر اعظم اور گورنر کی مجلس انتظامیہ کے ممبر رہ چکے ہیں۔

اور پھر کہتے ہیں:۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدّت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اور ایک دوسری نظم جو "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" ہے۔ فرماتے ہیں:۔

چشتیؒ[1] نے جس زمیں پر پیغامِ حق سُنایا
نانکؒ[2] نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

---

[1] حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بن غیاث الدین حسن سنجری سجستان میں پیدا ہوئے پندرہ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ترکہ میں صرف ایک باغ ملا جو ذریعہ معاش تھا۔ ابراہیم قلندر مجذوب سے ملاقات کے بعد ترکِ دنیا کی اور گھر بار چھوڑ کر سمرقند اور بخارا روانہ ہوگئے۔ جہاں قرآن حفظ کیا اور علوم دینی کی تکمیل کی اور ہارون (عراق) پہنچ کر شیخ عثمان ہارونی سے شرف بیعت حاصل کیا۔ ۵۶۱ھ مطابق ۱۱۶۵ء میں اجمیر شریف تشریف لائے۔ ۶ رجب ۶۳۳ھ مطابق ۱۲۳۵ء کو وفات پائی۔ یوں تو آپ کی کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے لیکن رسالہ در کسب نفس، رسالہ وجودیہ، حدیث المعارف، گنج الاسرار، دیوان معین، انیس الارواح اور دلیل العارفین منسوب ہیں۔ (بزم صوفیہ از ضیاء الدین عبدالرحمٰن)

[2] نانک تلونڈی (لاہور) ۱۴۶۹ء میں ایک کھتری خاندان میں پیدا ہوئے۔ سکھ فرقہ کے بانی تھے۔ بچپن ہی سے بت پرستی، توہمات رسم و رواج اور ذات پات سے نفرت تھی۔ انتہائی سخی پرور اور انسان دوست تھے۔ افغانستان، ایران، ترکی وغیرہ کی سیاحت کی۔ ۱۵۲۹ء میں بمقام کرتاپور وفات پائی۔

(بقیہ صـ۳۱ پر)

اقبال کی وطن دوستی اور ہندوستان سے بے پناہ پیار اور عقیدت کا اظہار نظم "ہمالہ" (۱۹۰۱ء) سے ہوتا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا دل اپنے ملک کی محبت میں سرشار اور اس کے نشے میں چور چور تھا۔ وہ ایک وسیع دل کے مالک تھے۔ یہ نظم شروع سے آخر تک ان کی محبت، عقیدت اور پیار کی غمازی کرتی ہے۔ اس نظم میں ایرانی اور یوروپی شعراء کا اثر بھی نمایاں طور پر ملتا ہے۔ اگرچہ یہ نظم محاکات کا ایک دلچسپ نمونہ پیش کرتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی قدیمی تہذیب کی نقشہ کشی بھی کرتی ہے۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
زیب دیتا ہے تجھے کہنے اگر ساراں جہاں
اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا
داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

اقبال کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک محیط ہے اس زمانے کی متعدد نظموں میں کہیں قدرتی مناظر کی عمدہ اور بے مثال تصویریں ہیں تو کہیں "مکڑا

(بقایا صفحہ ۳۰ سے آگے) علامہ نے نانک کو حسب ذیل شعروں کے ذریعہ خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:-

بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیم سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو ایک مردِ کامل نے جگایا خواب سے
(نظم "نانک" سے بانگِ درا)

اور مکھی، پہاڑ اور گلہری، بچے کی دعا، ہمدردی، ماں کا خواب، پرندے کی فریاد جیسی موثر نظمیں ہیں۔ کچھ نظموں میں فکری لہجہ بھی ملتا ہے۔ مثلاً عشق اور موت، شمع پروانہ، سرگذشتِ آدم، دل، صدائے درد، آفتاب، شمع، سید کی لوحِ تربت، تصویرِ درد، چاند وغیرہ۔

اس زمانہ کی شاعری میں ایک ایسا مترنم، بہاؤ اور دلآویز آہنگ رچا بسا نظر آتا ہے، جو اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ انھیں اپنے ابتدائی دور سے ہی تخیل اور زبان و بیان پر قدرت کاملہ حاصل تھی۔ جیسا کہ ملک راج آنند لکھتے ہیں:۔

"میرے نزدیک وہ اپنے ابتدائی کلام میں جس بامِ رفعت پر جلوہ گر نظر آتے ہیں ان کی نظیر زمانہ مابعد کی فارسی نظموں کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے بعض نظمیں انگریزی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ہمدردی کوپر[1] کی ایک نظم کے تتبع میں ہے۔ پیامِ صبح "لانگ فیلو[2]"

---

[1] ولیم کوپر (William Cowper) ۲۶ اپریل ۱۷۳۱ء کو پیدا ہوا اور ۲۵ اپریل ۱۸۰۰ء کو ایک طویل علالت کے بعد فوت ہوا۔ چرچل اور وارن ہسٹنگز سے دوستانہ مراسم تھے۔ اسکی نظموں میں My Mary اور To my Mothers Picture شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا جلد ۶ ص ۲۶۳)

[2] ہنری ووڈس ورتھ لانگ فیلو (Henry Wodsworth Longfellow) ۲۷ فروری ۱۸۰۷ء کو بمقام پورٹ لینڈ (یو۔ ایس۔ اے) میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۶ء میں ہرورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر

کی پیروی کی گئی ہے۔ عشق اور موت پر ٹینی سن کا اثر ہے اور "رخصت اے بزمِ جہاں" اور "ایک پہاڑ اور گلہری" میں ایمرسن کی تقلید کی گئی ہے۔ لیکن زبان و بیان کی لطافت استعارات، رنگینی اور خیال کی نزاکت کے اعتبار سے یہ نظمیں خالص مشرقی اور زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہیں۔"

(بقایا صفحہ ۳۲ سے آگے) مقرر ہوئے۔ جہاں تقریباً ۱۹ سال تک درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ اس نے تحصیل علم کے شوق میں متعدد بار فرانس، اسپین، اٹلی، جرمنی، ناروے، انگلستان اور دیگر یورپی ملکوں کا سفر کیا۔ ۲۴ مارچ ۱۸۸۲ء میں وفات پائی۔

(انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۶ صفحہ ۳۷۸)

۱؎ ٹینی سن (Alfred Tennyson) ۶ اگست ۱۸۰۹ء کو انگلینڈ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں ملکۂ انگلستان نے ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ اور سال آخر میں ..... Memorium شائع ہوئی اور Idylls of the King ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے جسکے ذریعہ ٹینی سن کی شخصیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ۶ اکتوبر ۱۸۹۲ء میں انتقال ہوا۔

۲؎ رالف والڈو ایمرسن (Ralph Waldo Emerson) ۲۵ مئی ۱۸۰۳ء کو بمقام بوسٹن (امریکہ) پیدا ہوا۔ وہ اپنے عہد کا ایک ممتاز شاعر اور انشا پرداز تھا۔ ۱۸۳۶ء میں اسکے خطابیہ مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا۔ جو "Nature" کے مقابلہ میں زیادہ مقبولیت تو حاصل نہیں کر سکا۔ لیکن اپنے حسن و عمل کی بنیاد پر ایک امتیازی حیثیت ضرور رکھتا ہے۔ اس کے کئی شعری مجموعے بھی شائع ہوئے۔ یورپ کی سیاحت بھی کی۔ ۲۷ اپریل ۱۸۸۲ء کو فوت ہوا۔

اقبال یوروپ کے قیام کے زمانہ میں بھی وطن دوستی کا راگ الاپتے رہے اس زمانے میں انھوں نے بڑی موثر اور پُر تاثیر نظمیں کہی ہیں اور مشرقی رکھ رکھاؤ مشرقی فلسفہ اور مشرقی تہذیب کا خاص خیال رکھا ہے۔ "میرا وطن" میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں رسول خدا نے فرمایا تھا کہ "مجھے ہندوستان کی طرف سے ربانی خوشبو آتی ہے"۔ شعر یوں ہے ؎

میرِ عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

"ہندوستاں ہمارا" میں اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ آپ کی شاعری کا دوسرا اہم دور ہے اس دور کے کلام میں فارسیت کا غلبہ ہے۔ لیکن مشاہدات کا جیسا خوشنما اور پرکشش رنگ چھایا ہوا ملتا ہے، وہ انتہائی موثر اور مسحور کن ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے اس دور کی شاعری لندن اور یوروپ کے ماحول میں پروان چڑھی ہے لندن میں آپ نے میگ ٹیگوٹ کے فلسفیانہ خیالات سے اپنے فکری اور نظری اصولوں کو سائنٹفک طرز دیا۔ میگ ٹیگوٹ کے علاوہ۔ ای۔ بی۔ براؤن اور ڈاکٹر نکلسن سے بھی استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر اقبال ——————

پینتیس

ولیم جیمس[1] اور غزالی[2] کے فلسفۂ شخصیت اور مذہبی تجربہ کی تردید کرتے ہوئے شخصیت ہی کو مذہبی تجربہ کی صداقت کی کسوٹی کے طور پر قبول کرتے ہیں اور جہاں انکے فلسفہ میں صداقت کی بو پاتے ہیں۔ وہیں اس کے حوالوں سے اشعار میں فلسفیانہ فکر پیدا کرتے ہیں۔

---

[1] یہ ۱۹ ویں صدی کے وسط میں پیدا ہوا اور فلسفہ کے اس امریکی مکتب فکر کا بانی تھا جو عملیت (Pragmatism) پر یقین رکھتا تھا۔ اسکی کتاب Varieties of Religious Experience بے حد شہرت رکھتی ہے۔

[2] محمد ابن محمد ابو حامد الغزالی ۱۰۵۸ء میں بمقام "طوس" پیدا ہوا۔ جارجان اور نیشاپور میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۰۹۰ء میں بغداد میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا۔ اسمٰعیلیوں کے خلاف زوردار مضامین لکھے۔ ۱۰۹۴ء میں ملازمت سے استعفیٰ دے کر اور گھر بار چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کی اور سلوک و معرفت کی طرف توجہ صرف کی۔ مکہ، مدینہ، اسکندریہ، دمشق اور عراق وغیرہ کی سیاحت کی ـــــ کثیر التصانیف تھے۔ ۶۹ کتابوں کا سراغ ملتا ہے۔ جن میں احیاء العلوم، میزان العمل، کیمیائے سعادت وغیرہ بے حد شہرت رکھتی ہیں۔ ۱۱۱۱ء میں فوت ہوا۔

الغزالی کا نظریہ تھا کہ عقل و شعور بیکار محض شے ہے وہ حقیقت کو سمجھنے میں مشکلات پیدا کرتی ہے۔ "وجدان" ہی ایک ایسا مفید ذریعہ ہے جس کے توسط سے حقیقت کا انکشاف کیا جا سکتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفۂ ارتیابت کو مذہبی تجربوں کی تنقید کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

اقبال ہکسلے[1] سے بھی متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جگہ جگہ اس کے فلسفہ کا حوالہ دیتے ہیں ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

---

[1] ۲۶ جولائی ۱۸۹۴ء کو "گوڈالمنگ" میں پیدا ہوا۔ باپ کا نام لیونارڈ ہکسلے اور ماں کا جولیا آرنلڈ تھا۔ لیونارڈ ہکسلے علم حیاتیات کا ماہر اور ایچ ہکسلے کا بڑا بیٹا تھا۔ جو ڈارون کے نظریۂ حیاتیات کا مبلغ اور حامی تھا۔ ہکسلے کی ماں مشہور انگریزی نقاد میتھیو آرنلڈ کی بھتیجی تھی۔ اس طرح ہکسلے کا سلسلۂ نسب ماں اور باپ دونوں طرف سے سائنس اور ادب کی مشہور شخصیتوں سے ملتا ہے۔

ہکسلے نے اپنی ابتدائی تعلیم سائنس سے شروع کی۔ علم حیاتیات کے مطالعہ کے دوران ۱۸ سال کی عمر میں بصارت سے محروم ہوگیا لیکن اس کے بعد بھی ٹائپ رائٹر اور استادوں کی مدد سے تعلیم جاری رکھی۔ اس نابینگی کی حالت میں ایک ناول مکمل کیا۔

بصارت کی کمزوری کے سبب سائنس چھوڑ کر انگریزی اور لسانیات کا مطالعہ شروع کیا۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ اٹلی میں رہا۔ جہاں اس نے کئی اہم مضامین اور افسانے لکھے۔ ۱۹۲۵ء اور ۱۹۲۶ء میں اپنی بیوی کے ساتھ ہندوستان اور ویسٹ انڈیز کا سفر کیا۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس سے خصوصی مراسم تھے۔ اور اس سے بہت زیادہ متاثر بھی تھا۔ ۱۹۳۴ء میں وسطی امریکہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سفر کیا اور وہیں ڈاکٹر ڈبلیو۔ ایچ۔ بیٹس ——— (W. H. Bates) سے اپنی آنکھوں کا علاج کرایا۔

۱۹۳۰ء اور ۱۹۲۵ء کے درمیانی عرصے میں اس کی مطبوعات ———

اقبال جس زمانہ میں کیمرج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اُس زمانہ میں انیسویں صدی کی یگانگت کے خلاف دو سمتوں سے یورشیں ہو رہی تھیں۔ ایک

Crome 'New 'Point Counter Point'. Yellow'

World Brave اور Eyeless in Gaza شائع ہوئیں۔

ہکسلے کے ابتدائی ناولوں پر فرانسیسی ناول نگاروں خصوصاً اناطول کے اثرات زیادہ ہیں اور اس کے ساتھ ہی فرانس کے انحطاط پرست شاعروں ورلین، بیمو، اور بودیلیر کے اثرات بھی نظر آتے ہیں۔

ہکسلے کے دو ناول Antic Hay Pointe Counter Point میں کائین اور اسپنڈل جیسی شیطانی قوتوں کی نشانیاں ملتی ہیں۔ Point Caunter اور Point Do What You Will, میں فلسفہ زندگی کی بڑی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔

ہکسلے نظریاتی طور پر ٹالسٹائے اور کارلائل کے طرز فکر کا حامی تھا چنانچہ وہ ذہن اور انسانی نفسیات کی تبدیلی سے معاشرے کی تبدیلی اور اصلاح پر یقین رکھتا ہے۔ اس کے اس نظریاتی فکر میں تشیخ اور پرگندگی کی پرچھائیاں بھی ہیں۔ اس کی سماجی اصلاح عقلی سے زیادہ مذہبی اور غیر سائنسی ہے۔ جیسا کہ وہ خود Ends and Means میں یہ لکھتا ہے۔ "انسانی معاشرے کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کے انسانی گروہ اس طرح زندگی گزارنے کی کوشش کریں جس سے ایک دوسرے کو روحانی مسرت اور عظمت محسوس ہو اور صرف یہی واحد طریقہ ہے جس سے معاشرہ بہتر بنیادوں پر کھڑا کیا جا سکتا ہے۔"

ارٹیس

ان فلسفیوں کی طرف سے جنھیں برٹرنڈ رسل[1] ادبی فلسفی کہتا ہے جو ایک طرح

---

[1] ۱۸ مئی ۱۸۷۲ء کو برطانیہ کے ایک معزز اور تاریخ ساز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ برٹی گھریلو نام تھا۔ جو اپنی انتہا پسندانہ پالیسیوں کے سلسلے میں کافی مشہور ہوئے۔ لارڈ ولیم رسل نے شاہ چارلس دوم کی پالیسیوں کے خلاف بغاوت کی تھی۔ جس کی پاداش میں انھیں موت کی سزا ملی۔ برٹرنڈ رسل کے دادا اور رسل کے پہلے ارل لارڈ جان رسل ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں وزیر اعظم تھے۔

برٹرنڈ رسل تین برس کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ دادا نے پرورش کی۔ تعلیم ٹرینٹی کالج کیمرج میں ہوئی۔ ریاضیات اور اخلاقی سائنس میں امتیازی نمبر حاصل کئے اور اول آئے اور پھر وہیں لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۸ء میں رائیل سوسائٹی کی فیلوشپ حاصل کی۔ علمی دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ سیاست سے بھی دلچسپی قائم رکھی۔ ۱۸۹۶ء سے کتابوں کی اشاعت شروع ہوئی۔

ابتدا میں نازیوں کے مخالف تھے لیکن پہلی جنگ عظیم میں اس کی حمایت کرنے پر حکومت برطانیہ نے انھیں ناپسندیدہ شخصیت قرار دیتے ہوئے ٹرینٹی کالج کی لیکچرشپ ختم کرادی۔ ۱۹۱۸ء میں قید و بند سے بھی واسطہ پڑا۔ اسی زمانہ میں انھوں نے "فلسفۂ ریاضیات کی تمہید" رسٹن جیل میں مکمل کی۔

جنگ کے خاتمہ کے بعد لیبر پارٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے روس کا دورہ کیا۔ ایک کتاب "بولشوزم۔ عمل اور نظریہ" لکھی۔ ۱۹۲۰ء میں چین کا سفر کیا۔ پیکنگ یونیورسٹی میں کئی لیکچر دیئے۔ اور ایک کتاب "مسئلہ چین" لکھی۔

جنگ کے خاتمہ کے فوری بعد انھیں ٹرینٹی کالج کی لیکچرشپ بحال کی گئی۔ مگر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ ۱۹۳۱ء میں بڑے بھائی کی وفات کے بعد "ارل" کا اعزاز حاصل کیا۔ ہندوستان دوست تھے۔ مہاتما گاندھی کی قدر کرتے تھے۔ انگلینڈ میں قائم شدہ انڈیا لیگ کے صدر تھے۔ انھوں نے تقریباً (بقایا صفحہ ۲۹ پر)

کی جذباتی بغاوت کے سرخیل تھے۔ دوسری طرف مارکس[1] کی معاشی بغاوت کی پروردہ فلاسفی تھی۔ رسل ان لوگوں کو اسی بنیاد پر سائنسی تاریخ اور تاریخی سائنس کا علمبردار کہتا ہے۔ اقبال کی بدقسمتی تھی کہ ان کی رومانیت اور جذباتیت پہلے

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۳۸ کا) ۷۰ کتابیں لکھی ہیں نوبل پرائز یافتہ تھے۔ غیر مقلد دانشوروں میں شمار ہوتا تھا۔ انھوں نے تمام عمر اپنے عقاید و فلسفہ پر پوری ثابت قدمی سے عمل کیا۔ انھوں نے نیوکلیائی اسلحات کے خلاف آواز اٹھائی اور برٹش پارلیمنٹ کے سامنے دھرنا بھی دیا۔ انھوں نے گاندھی جی کے طریقۂ کار کو سائنٹفک بنیادوں پر استوار کیا اور تمام عمر اس پر عمل کرتے رہے۔ آخر ۷۹ سال کی عمر میں ۳ فروری ۱۹۷۰ء کو انتقال کیا۔

[1] (Karl Marx) نسلی اعتبار سے یہودی تھا۔ ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ جس نے اپنی تحریروں کے ذریعہ سرمایہ دارانہ نظام کی تنقید کی اور اس کی بیخ کنی پر زور دیا۔ اس نے بون اور برلن میں قانون کی تعلیم حاصل کی لیکن قانون کے جھمیلوں سے اکتا کر تاریخ و فلسفہ کا مطالعہ شروع کیا۔ وہ ابتدا میں نظریاتی طور پر ہیگل کا پیرو تھا۔ لیکن بعد میں اُس سے منحرف ہوکر ایک بالکل نئے نظریئے کی بنیاد رکھی جو مارکسی نظریہ کہلایا۔ اس کے خیالات میں یہ انقلابی تبدیلی کیوں اور کیسے آئی توجیہہ طلب ہے۔ ۱۸۴۲ء میں رائنیش گزٹ (Rhenish Gazettee) کی ادارت کی۔ ۱۸۴۳ء میں شادی کے بعد "اقتصادیات" کے مزید مطالعہ کے لئے پیرس کا سفر اختیار کیا۔ ۱۸۴۵ء میں فرانس سے نکال دیئے جانے کے بعد متعدد ملکوں کی سیاحت کی اور آخر میں لندن پہنچا جہاں آخری تک رہا۔ وہیں ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔

اس نے فرانس سے نکلنے کے بعد انگلز (Engels) کی رفاقت میں کمیونسٹ لیگ..... (Communist League) کی تنظیم کی اور ۱۸۴۸ء میں اُس نے اپنا نامۂ منشور.... (Manifesto) جاری کیا اور سرمایہ (Kapital) تخلیق کی جس کو اشتراکیت کی گیتا یا انجیل سمجھنا چاہیئے۔

نیطشے[1] اور برگساں[2] کی طرف لے گئی۔ نیطشے کے فن میں قوت اور فکر جلال کی اعلیٰ قدریں تھیں۔ خیال کی رومانیت کے لیے ان قدروں میں بڑی کشش تھی۔ اور دوسری طرف برگساں عقل کے بجائے وجدان کو سراہتا تھا اور وقت کو اہمیت دیتا تھا۔ نیطشے کے نزدیک تاریخ اپنے آپ کو دہرانے کا ایک سلسلہ ہے اور ہر تکرار ایک فوق البشر سے ہوتی ہے۔ برگساں تاریخ کو حافظے سے تشبیہہ دیتا ہے جس کی مدد سے مستقبل کی تعمیر میں مدد لی جا سکتی ہے۔

---

۲ ؎ (Henry Berson) ۱۸ ر اکتوبر ۱۸۵۹ء کو بمقام پیرس (فرانس) پیدا ہوا ۱۹۰۰ء سے ۱۹۲۱ء تک درس و تدریس سے منسلک رہا ۔ ۱۹۲۷ء میں نوبل پرائز کا حق دار ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں انتقال کیا۔

برگساں نے بھی عقل اور حواس کے مقابلے میں وجدان کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ کیونکہ وجدان کے ذریعہ ہی اشیاء کی قدر و قیمت آنکی جا سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اس کے طریق فکر کے امتیاز سے اس کا نظریہ وجدانیت ہے اور تاریخ کے لحاظ سے اس کا فلسفہ حیاتیات Vitalism ہے۔"

۱ ؎ فریڈرک ولہلم نیطشے (Friedrich Wilhelm Netzsche) ۱۵ ر اکتوبر ۱۸۴۴ء کو پرشن سیکسنی میں پیدا ہوا۔ بون اور برگ میں تعلیم حاصل کی ۔ ۲۶ ر اگست ۱۹۰۰ء کو فوت ہوا۔

نیطشے کا فلسفہ یہی قدروں (Values) کی تنقید ہے اس کے نزدیک عزم للقوۃ (Will to Power) سے اعلیٰ فضیلت ہے۔ وہ تدوین نظام کا قائل نہیں بلکہ وہ اس تعلیم کا پیرو ہے جو نہ تخیلی ہو اور نہ جذباتی بلکہ اس کا رشتہ قوت عمل اور حرکت سے ہو۔ جو مشکلات اور دشواریوں کا مقابلہ کر سکے اور ان پر غلبہ پا سکے،

(حکایت فلسفہ از ول ڈوران ۔ مترجم مولوی احسان احمد)

نیطشے کا فوق البشر مذہبی اقبال کے اثر سے خیر البشر اور مردِ مومن کے رُوپ میں نمودار ہوا۔ اقبال کی ذہنی ساخت پر ایک خاص اثر ٹامس آرنلڈ کا بھی ہے۔ غرض یوروپ نے انھیں بہت کچھ دیا۔ انھیں مغربی افکار سے آشنا کیا۔ انھیں قوموں کی تقدیر حیات، ارتقائے کائنات کے مسائل پر غور کرنا سکھایا۔"

علامہ نے قیام یوروپ کے زمانہ میں شعر و سخن سے دلچسپی برائے نام قائم رکھی اور اپنی تمام تر توجہ اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مرکوز رکھی۔ جس کے نتیجے میں شعر و شاعری سے بے توجہی برتنے لگے، لیکن شیخ عبدالقادر اور پروفیسر آرنلڈ نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔

یوروپ میں کہی گئی نظموں میں ایک قسم کی بے چینی، تجسس اور گہرائی و گیرائی نظر آتی ہے۔ ایک نظم میں کہتے ہیں، قدرت کا یہ عجیب ستم ہے ؎

انسان کو راز جو بنایا — راز اس کی نگاہ سے چھپایا
بیتاب ہے ذوقِ آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا

دوسری نظموں میں تجسس اور تلاش کی گونج ہے: ؎

اگر کوئی شے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارے کی تمنا ہے دل کو سودا ہے جستجو کا"

انھیں یوروپ کے طور و طریق، رہن سہن، فکر و خیال اور مجموعی تہذیب نے متاثر بھی کیا اور بدگمان بھی۔ انھوں نے خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیوں کو بھی طشت از بام کیا۔ اور بعض ایسی خامیاں دیکھیں جنھیں دیکھ کر پژمردگی اور دل برداشتگی ہوئی۔ یہی سبب ہے کہ ان کے دل میں اسلام کی تعلیم اور اصولوں سے عقیدت اور احترام کا جذبہ پرورش پانے لگا۔ ایک نظم میں اہل یوروپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

چنانچہ اِس زمانہ کی کئی نظموں میں در پردہ اِس خواہش کا اظہار ملتا ہے۔

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہو گا

قیام یورپ کے زمانہ میں کہی گئی نظموں میں.... کی گود میں بلّی دیکھ کر، سوامی رام تیرتھ[1]، کلی، سلیمیٰ[2]، تنہائی اور "دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" یادگار نظمیں ہیں۔ ہائیڈل برگ" دریائے نیکر کے کنارے ایک شام" میں ٹھوس جزوئیات کی احاطہ بندی

---

[1] ۱۸۷۳ء میں گوجرانوالہ (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے۔ اور ایم۔ اے (ریاضی) کے امتحانات پاس کئے۔ اورینٹل کالج لاہور میں ریاضی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ویدانت سے بے حد متاثر تھے۔ رام سے بے پناہ عقیدت تھی۔ چنانچہ ہفتوں بارہ دری کامران (دریائے راوی) میں محویت کے عالم میں بیٹھے رہتے اور جب بے چین ہو جاتے تو دور تک نکل جاتے۔ بڑے بڑے روسا اور راجہ ان کے معتقدین میں تھے۔ سیاحت کے شوقین تھے۔ ۲۰ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہردوار تشریف لے گئے۔ جہاں دریائے گنگا کے کنارے اپنے شاگردوں اور عقیدتمندوں کو ویدانت کا سبق دیا کرتے تھے۔ ایک دن دوران غسل تیرتے ہوئے بہت دور تک نکل گئے اور حالتِ جذب میں ڈوب گئے۔ تلاش بے کار ثابت ہوئی۔ تین دن بعد خود بخود نعش کنارے آگئی اور عقیدتمندوں نے بڑے احترام و عقیدت کے ساتھ ارتھی اٹھائی اور آگ کے سپرد کر دیا۔
(سوامی رام تیرتھ از پنڈی داس)

[2] سلیمیٰ ادبیات عرب میں ایک "معشوقہ" کے نام سے معروف ہے۔

کی گئی ہے۔ جس میں حسنِ خوابیدہ اور اس کے تمام جزویات کا تاثر پوشیدہ ہے۔
نظم کے ابتدائی اشعار میں ہی "سکون" کی کیفیت بھرپور انداز میں اپنا تاثر ڈالتی ہے:۔

کچھ ایسا سکوت کا فسوں ہے　　نیکر کا خرام بھی سکوں ہے

۱۹۰۸ء میں ولایت کی واپسی کے بعد اُن میں اسلامیت اور بھی زیادہ پیدا ہو گئی تھی۔ اسلام اُن کا اوڑھنا، بچھونا بن گیا تھا۔ اقبال کے قدردانوں میں سر عبدالقادر، سید سلیمان ندوی، مولانا جوہر، ماہر القادری، شبلی، حالی، داغ اور اکبر الہ آبادی بھی تھے۔ چنانچہ اقبال نے اکبر کے طرز میں چند نظمیں کہہ کر اپنی محبت اور اپنائیت کا اظہار کیا تھا۔ یہ اشعار "اکبری اقبال" کے نام سے مشہور ہوئے۔

مسلمانوں کے علاوہ نامور ہندو حضرات بھی اقبال سے عقیدت رکھتے تھے اور اُن کی شاعری کے دلدادہ تھے۔

۱۹۰۸ء کے بعد آپ کے کلام میں اسلامیت کافی حد تک دخیل ہو چکی تھی۔
۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء کا زمانہ مسلمانانِ عالم کے لئے بڑا تکلیف دہ اور پریشان کن تھا۔
بلقان کی جنگ اور طرابلس کا معرکہ مسلمانوں کو خون کے آنسو رلا رہا تھا۔ اور ان میں ایک طرح کا جذبۂ حریت بھی پیدا کر دیا تھا۔ عام مسلمان ترکی کا حامی تھا۔ اطالیہ (اٹلی) نے ترکی سے طرابلس چھین لیا تھا اور بلقان کی عیسائی ریاستوں نے بغاوت کر دی تھی۔ ان تمام حالات نے اقبال کو انتہائی مضطرب اور بے چین کر دیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اسی زمانہ میں شکوہ لکھا اور جس کے بعض حصے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں پڑھے گئے۔ ان سے عوام کا جوش و خروش بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۱ء کو لاہور کی شاہی مسجد میں "خونِ شہدا کی نذر" کے عنوان سے

جو نظم پڑھی تھی، اُسی نے ایک قیامت برپا کر دی تھی۔ بقولِ منشی فوق "کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے لبریز نہ تھی۔ کوئی دل ایسا نہ تھا جو تڑپ نہ اٹھا ہو"۔

گراں جو مجھ پہ یہ ہنگامۂ زمانہ ہوا
جہاں سے باندھ کے رختِ سفر روانہ ہوا
فرشتے بزمِ رسالت میں لے گئے مجھ کو
حضورِ آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

حضورؐ نے پوچھا:۔

نکل کے باغِ جہاں سے برنگِ بُو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟

اقبالؔ نے عرض کیا:۔

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گُل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بُو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنّت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری اُمّت کی آبرو اس میں
طرابلسؔ کے شہیدوں کا ہے لہُو اس میں

اس کے بعد انھوں نے جنگ کے متعلق کئی نظمیں اور لکھیں جن سے

مسلمانوں میں بیداری کی نئی لہر پیدا ہوئی۔ ترکی کی جنگ، کانپور کی مسجد کا واقعہ، احاطہ بنگال کی تقسیم کا واقعہ (۱۹۰۸ء)۔ _____ خصوصاً کانپور کی مسجد کا واقعہ اتنا زیادہ دردناک تھا کہ اقبال کے جذبۂ حریت نے ایک ایسی نظم کہلائی جس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے سلسلے میں انگریزی استبداد سے مسلمانوں کا جو ٹکراؤ ہوا اور مسجد کے بعض اجزاء کو انہدام سے بچانے کے لیے بہت سے مسلمان جن میں کم عمر بچے بھی شامل تھے۔ انگریزی فوج کی گولہ باری میں شہید ہوئے۔ اس واقعہ کا اثر لازمی طور پر مسلم سیاست پر پڑنا لابدی تھا۔

اسی دور میں شمع و شاعر، جیسی نظم کی تخلیق کی جو ایک معنی میں بانگِ درا میں دل کی حیثیت رکھتی ہے۔ فاطمہ اور شکوہ جواب شکوہ اس دور کی زندہ و تابندہ یادگار ہیں۔ ان کے علاوہ غلام قادر روہیلہ، شبلی و حالی، عرفی، نانک، بلال، شیکسپیئر، ہمایوں، رام، حضور رسالت مآب جیسی شخصیتوں پر بھی نظمیں ملتی ہیں جو اپنی اپنی جگہ اپنا ایک مخصوص مقام رکھتی ہیں۔

فاطمہ[1] بنت عبداللہ (۱۹۱۲ء) میں اس مجاہدہ کی شہادت کا ذکر ہے جو جنگ طرابلس[2] میں پانی پلاتے ہوئے شہید ہوئی۔ اور عرب کی اس باوقار روایت

---

[1] اس وقت اس کی عمر صرف ۱۴ سال تھی

[2] ستمبر ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے طرابلس پر حملہ کیا تو شیخ سنوسی مرحوم نے بے سروسامانی کے عالم میں جہاد کا حکم دیا۔ سنوسی محمد بن علی بن سنوسی بانی فرقہ سنوسیہ ۱۷۸۸ء میں افریقہ میں پیدا ہوئے اور ۱۸۵۹ء میں وفات پائی۔ سنوسیہ تحریک وہابی تحریک سے مشابہ تحریک تھی۔ شیخ کے دو لڑکے محمد شریف اور المہدی تھے۔ المہدی ۱۸۴۵ء میں پیدا ہوا اور تخت پر وہی بیٹھا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بھتیجا احمد الشریف تخت پر بیٹھا۔

(بقیہ ص ۴۶ پر)

کی یاد تازہ کردی جب ام سلمیٰ اور حضرت خولہ جیسی مجاہدات عربوں میں ایک نیا ولولہ اور نیا جوش پیدا کردیا کرتی تھیں۔ اقبال نے اسی روایت کی یاد تازہ کرتے ہوئے فاطمہ کی شجاعت اور قربانی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

فاطمہ تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم برپا ہوئی۔ اس کے دو سال بعد انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں اسرار خودی کے کچھ حصہ سنائے جو ۱۹۱۵ء میں چھپ چکی تھی۔ اس کے بعد رموز بے خودی ۱۹۱۸ء میں اور پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں شائع ہوئیں۔ ان فارسی مثنویوں کے بعد تو انھوں نے اردو میں کہنا ہی ترک کردیا۔ ان کی فارسی شاعری کا چرچا عام ہوا تو فارسی کے مشہور شاعر مولانا گرامی نے خاص طور پر علامہ کے فکرِ سخن کی داد دی۔ اور ڈاکٹر نکلسن نے بھی ان کتابوں کو دیکھ کر کہا تھا کہ "ان کتابوں میں ایک ہی آرزو انگیز گیت ایک ہی افسوں ہے جسے ایک پیمبر کی صدا کہنا چاہیئے" پروفیسر نکلسن نے ۱۹۲۰ء میں اسرارِ خودی کا انگریزی میں ترجمہ

(بقیہ صـ۴۵ کا) سیدی احمد نے ترکوں کا ساتھ دیا اور دادِ شجاعت دی۔ بعد میں سیدی احمد کو المہدی کے لڑکے سید محمد آل ادریس کے حق میں دست بردار ہونا پڑا۔ ۱۸-۱۹۱۷ء میں ترکوں کے خلاف امیر فیصل نے برطانیہ کی مدد کی۔ امیر فیصل شریف حسین حاکم مکہ کے بیٹے تھے۔

(الہلال۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء)

کیا اور مسٹر ہربرٹ ریڈ نے مغربی شعراء خصوصاً والٹ وھٹمین سے موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"وھٹمن کا نصب العین اس اعتبار سے بہت اہمیت رکھتا ہے کہ وہ نظری نہیں بلکہ عملی ہے، صرف ایک شاعر ہے جس کے ہاں یہ چیز نظر آتی ہے اور وہ بھی ہماری نسل اور قوم سے نہیں۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے۔ جن کی نظم اسرارِ خودی کا ترجمہ ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے کیا ہے اور میکملن کے اہتمام میں شائع ہوا ہے ادھر ہمارے ملک کے شاعر تو کیٹس[1] کے زمانے کی پرانی ڈگر پر چلے جا رہے ہیں اور بلبلوں اور پرندوں یا دوسرے چھوٹے چھوٹے موضوعات پر نظمیں کہہ رہے ہیں۔ اور اُدھر لاہور میں ایک ایسی نظم شائع ہو رہی ہے جس نے ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں پر پوری طرح قبضہ جما لیا ہے۔"

اقبال کے فارسی کلام کے تین مجموعہ بانگ درا کی اشاعت کے پیشتر شائع ہو چکے تھے اور ان کی تمام تر توجہ فارسی کی طرف منتقل ہو چکی تھی۔ اس تبدیلی کے اسباب کیا تھے؟ اور کون سی وجوہات تھیں جس نے اقبال کی فکرِ رسا کو فارسی کی طرف موڑ دیا اس

---

[1] کیٹس (John Keats) ۳۱ اکتوبر ۱۷۹۵ء کو پیدا ہوا۔ اس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ۱۸۱۷ء میں شائع ہوا جس میں ۱۷ سانیٹس، ۱۳ تمثیلیں اور کچھ دیگر نظمیں شامل ہیں۔
دوسرا مجموعہ "Endimion" ۱۸۱۸ء میں چھپا، تیسرا آخری مجموعہ My Pesion ۱۸۲۰ء میں چھپا۔
جس کی وفات ۲۳ فروری ۱۸۲۱ء کو ہوئی (Poets of G. H. Crump
The Romantic Revivalss. Oct. 1933—Chapter VI
Page 203

سلسلے میں عبدالقادر بانگ درا کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"فارسی میں شعر کہنے کی رغبت اقبال کی طبیعت میں کئی اسباب سے پیدا ہوئی ہوگی، اور میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اپنی کتاب فلسفۂ ایران (عجم) کے لئے جو کتب بینی کی۔ اس کو بھی اس تغیر مذاق میں دخل ہو گا۔ اس کے علاوہ جوں جوں ان کا مطالعہ علم فلسفہ کے متعلق گہرا ہوتا گیا اور دقیق خیالات کے اظہار کو جی چاہا تو انھوں نے دیکھا کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کا سرمایہ بہت کم ہے۔ اور فارسی میں کئی فقرے اور جملے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایسے ملتے ہیں جن کے مطابق اردو میں فقرے ڈھالنا آسان نہیں۔ اس لئے وہ فارسی کی طرف مائل ہو گئے"۔

سر عبدالقادر کے خیالات، قیاسات پر مبنی ہیں۔ اور ان کے اس اقتباس سے کوئی ایسا سرا نہیں ملتا، جو اس بات کا کوئی حتمی سراغ دے سکے۔ پس زیادہ سے زیادہ یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کو ادبیات ایران کے مطالعہ کا موقعہ اس وقت زیادہ ملا، جب وہ جرمنی میں فلسفۂ ایران کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ رہے تھے۔ بہر حال کوئی وجہ رہی ہو۔ اقبال کی فارسیت یا فارسی شاعری اتنی ہی جامع اور معیاری ہے جتنی ایرانی شعراء کی فارسی شاعری، سید محیط طباطبائی (ایرانی مصنف) لکھتے ہیں [1]:-

"اقبال ہندوستان کی سرزمین پر پیدا ہوئے لیکن ان کی ذہنی ترقی و پرورش ایرانی زبان اور افکار کی آغوش میں ہوئی۔ اگرچہ وہ بظاہر لاہور کی خاک میں مدفون ہیں۔ ان کا اصلی مزار اہل دل کے سینوں میں ہے، جو ان کے سات فارسی دیوانوں

---

[1] شیرازہ۔ شمارہ ۳ جلد ۱۲

میں ان کی ابدی زندگی کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

شروع شروع لوگ اقبال کی فارسی شاعری کو معیاری فارسی شاعری کا نمونہ قرار دینے میں اجتناب برتتے تھے۔ لیکن بعد میں اقبال کی یہی فارسی شاعری معیاری شاعری قرار دی گئی۔ اور ایرانی مدبّروں اور شاعروں نے اقبال کی فارسی شاعری کو اپنے لئے طرۂ امتیاز جانا ہے جیسا کہ تقی زادہ لکھتے ہیں:۔

"ان کے کلام کا اکثر حصّہ ہماری زبان میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ پاکستان اور ایران کی مشترکہ ملکیت ہیں"۔

اقبال چونکہ کشمیری برہمن تھے جو اپنی تہذیب و تمدن کی آرائش و زیبائش اور اس کی تکمیل کے لئے فارسی تعلیم اور فارسی شعر و ادب کو لازمی تصور کرتے تھے۔ ایران کے مقتدر شعرا اور علما نے ان کی فارسی شاعری کے متعلق بڑی وقیع رائے دی ہے جبکہ اقبال بنیادی طور پر اردو کے شاعر تھے، لیکن فارسی ادب کا مطالعہ اور ایرانی تہذیب نے ان کے ذوقِ مطالعہ کو مہمیز کیا ہے۔ اور فارسی ادب کے خزانے میں اپنی تصانیف سے بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ انھیں فارسی کے ساتھ ذہنی اور روحانی دونوں طرف سے گہرا لگاؤ تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

اگرچہ ہندی در عذوبت شکر است — طرزِ گفتارِ دری شیریں تر است
فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت — جامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
فارسی از رفعتِ اندیشہ ام — در خورد با فطرتِ اندیشہ ام

جگن ناتھ آزاد ان کی فارسی شاعری پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اقبال نے جو تڑپ، ولولہ، تازہ اور سوز اردو شاعری کو دیا۔ وہی

کرشمہ اُن کے دلِ ناصبور نے فارسی میں دکھایا۔"

آقائے محمد حسین مشائخ فریدنی لکھتے ہیں:۔

"اقبال نے فارسی زبان کو اس زمانے میں جبکہ یہ زبان صرف قبروں یا مزاروں کے کتبے اور لوحیں لکھنے یا یونانی حکیموں کے نسخوں تک محدود رہ گئی تھی۔ ایک ادبی زبان کی حیثیت سے دوبارہ زندہ کیا۔"

۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم ختم ہوئی، لیکن انگریزوں نے ہندوستانیوں سے کیے گئے تمام وعدے فراموش کر دیئے، اور ایک ایسا قانون جاری کیا، جو بدنام "رولٹ ایکٹ" کے نام سے مشہور ہے۔ "رولٹ ایکٹ" کے سلسلے میں ہندوستان کے بعض حصوں خصوصاً پنجاب میں زبردست احتجاج شروع ہوا۔ اس کو فرو کرنے کے لئے مارشل لا لگا اور جلیانوالہ باغ کا سانحہ پیش آیا۔ اس سے سارے ملک میں آگ لگ گئی۔ ۱۹۱۹ء میں ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کی ابتدا ہوئی۔ اِدھر جرمنی کی ہار کی وجہ سے اور ترکی کے تمام علاقوں پر انگریزوں کے تسلّط نے مسلمانوں کو رنجیدہ کر دیا تھا اور انگریزوں کے ترکی سلطنت اور جزیرۃ العرب پر اپنا تسلّط برقرار رکھنے کے منصوبے نے ہندوستان کے مسلمانوں میں زبردست بے چینی پیدا ہو گئی۔ بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔ کانگریس نے کافی تقویت حاصل کی۔ ہندو مسلم اتحاد نے انگریزوں کی شاطرانہ چالوں کو کم از کم عارضی طور پر ہی سہی، بالکل ناکام بنا دیا تھا۔ ان تمام واقعات کا علامہ کے دل پر گہرا اثر تھا۔ انھیں ہندوؤں اور مسلمانوں کی اس باہمی رواداری، اتحاد و اتفاق اور بھائی چارگی سے بے پناہ خوشی حاصل ہوئی تھی۔ لیکن ان کی یہ خوشی عارضی

ثابت ہوئی۔ انگریزوں کی مکاری اور ڈپلومیسی رنگ لائی۔ اور ایک بار پھر دونوں قومیں الگ الگ راہوں پر چل پڑیں۔ ۲۳-۱۹۲۱ء کے اس مثالی ہندو مسلم اتحاد کو انگریزوں نے پارہ پارہ کر دیا تھا، اور جا بجا فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو چکے تھے۔ ان واقعات نے اقبال کو دل برداشتہ کر دیا اور انھوں نے مسلمانوں میں رواداری، بھائی چارگی اور صبر و قناعت پیدا کرنے کے لئے متعدد نظمیں لکھیں۔ انھی دنوں وہ پیامِ مشرق لکھنے میں مصروف تھے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی

۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہر کے قید ہونے پر بھی ایک نظم کہی اس زمانے میں "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" جیسی نظمیں پڑھیں۔ انھوں نے طلوعِ

۱۔ ۱۸۷۸ء میں رام پور میں پیدا ہوئے۔ علی گڈھ کی تعلیم کے بعد آکسفورڈ سے بی۔ اے (آنرز) کی ڈگری لی۔ ملک کی آزادی میں مولانا نے پرجوش قیادت کی اور جیل کی سختیاں جھیلیں۔ تحریکِ خلافت کو آگے بڑھایا۔ کامریڈ (انگریزی) اور ہمدرد (اردو) روزناموں کی ادارت کی۔ شاعر بھی تھے۔ جوہر تخلص تھا۔ ہندوستانی وفد کی قیادت کی اور لندن میں ہی (بقایا صفحہ ۵۲ پر)

اسلام میں مصطفےٰ کمال[1] پاشا سے ترکی کو منظم کرنے اور مسلمانانِ عالم کو متحد کرنے کی طرف امید افزا اشارے کئے ہیں۔ انھیں کمال پاشا سے بڑی امیدیں تھیں۔ لیکن وہ تمام امیدیں اس وقت پامال ہوگئیں جب کمال نے ترکی میں جمہوری حکومت قائم کرنے کے لیے خلافت کو ختم کر دیا۔

تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ان کی نظم "دریوزۂ[2] خلافت" اپنی نشتریت اور دروبینی میں ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ اس نظم کی اشاعت کے بعد ۱۹۲۱ء میں انھوں نے جنگ عظیم کے پس منظر میں "خضرِ راہ" تخلیق کی۔ جسے پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ۳۷ ویں سالانہ اجلاس میں ۱۶ر اپریل ۱۹۲۲ء کو پڑھی تھی۔ ایک

(بقیہ صـ۵۱ کا) ۴ر جنوری ۱۹۳۱ء کو انتقال فرمایا۔ بیت المقدس میں مدفون ہوئے

(My Life A Fragment) ازشاہ محمد اشرف لاہور ۱۹۴۲ء

[1] ۱۲ر مارچ ۱۸۸۱ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۰۱ء میں فوج میں ملازمت شروع کی۔ دمشق میں فوجی خدمات انجام دینے کے بعد مقدونیہ بھیجے گئے۔ ۱۹۱۱ء میں طرابلس میں عربوں کی ایک باقاعدہ فوج تیار کی۔ ترکی کے اس مردِ آہن نے بڑی ہمت اور عمدہ کارکردگی کی بنا پر ترکی کو پورے طور پر تباہ ہونے سے بچایا۔ ۱۹۲۰ء میں "انگورا" کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت ختم کر کے سلطان عبدالمجید خاں کو جلاوطن کر دیا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں ترکی جمہوریہ کے پہلے صدر چنے گئے۔ مصطفےٰ کمال نے ہی قسطنطنیہ اور سمرنا کو غلامی سے آزاد کرایا۔ ۱۰ر نومبر ۱۹۳۸ء کو استنبول میں انتقال کیا

[2] عربوں کی غداری کے سبب ترکوں کو شکست اٹھانی پڑی اور خلافت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ترکی کو ایک بھیانک حقیقت کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں ایک وفد لندن گیا اور ناکام واپس ہوا۔ چنانچہ اسی پس منظر میں یہ پوری نظم لکھی گئی ہے۔

جذبات کا دریا تھا جو آغاز سے انتہا تک پورے تموج پر تھا۔ جس کی ابتدا ایک گہرے تفکر اور خاموش تلاطم کے انداز میں ہوتی ہے جو بعد میں ایک طوفانی رُخ اختیار کر لیتی ہے اور درمیان نظم خضر کے توسط سے جو امید و یقین کی شمع روشن کرتے ہیں وہ ان کی رجائیت کو اور بھی زیادہ اُجاگر کر دیتی ہے۔

اقبال نے صحرانوردی کی وجہ، رازِ زندگی، حقیقت سلطنت، سرمایہ داری اور مزدور کی کشمکش اور دنیائے اسلام کا مستقبل جیسے فکری موضوعات کو حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور نظم کے اختتام پر ملّتِ اسلامیہ کے منتشر ہونے کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ قومیت، نسل و زبان، تاریخ اور ملک کے مشترک ہونے سے بنتی ہے نہ کہ ان میں امتیاز کرنے سے۔ یہی اسلام کا صحیح اور صالح پیغام ہے۔

۱۹۲۲ء میں ان کی ایک اور نظم "طلوعِ اسلام" فتح قسطنطنیہ کی ایک عظیم داستان کی طرف اشارہ کرتی ہے جب مصطفےٰ کمال پاشا نے انتہائی مشکل حالات میں ترکی کو ایک نئی زندگی سے روشناس کیا اور زندہ رہنے کا طریقہ بتلایا۔

۱۹۲۳ء میں "پیامِ مشرق" گوئٹے[1] (جرمن) کے سلام مغرب اور دیوانِ مشرقی کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس میں متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں شامل ہیں (گوئٹے نے

---

[1] (Johnn Wodfgang Goethe) ۲۸ اگست ۱۷۴۹ء کو جرمنی میں پیدا ہوا۔ وہ اپنے عہد کا عظیم المرتبت شاعر اور ادیب تھا۔ "فاؤسٹ" اس کا شاہکار ہے۔ جس کے ذریعہ انسانی ارتقار کی داستان منضبط کی گئی ہے۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو وفات پائی۔

حافظ کی غزلوں کے جواب میں کچھ نظمیں دیوانِ مشرقی کے نام سے شائع کی تھیں) جو دراصل چار حصّوں پر مشتمل ہے۔ شروع کے ۸۰ صفحات پر قطعات اور رباعیات ہیں دوسرے حصّہ اذکار میں کئی چھوٹی بڑی نظمیں، تیسرے حصّہ میں "جویدہ" ساقی مئے باقی، کے عنوان کے تحت حافظ کی خودی اور شراب معرفت، اور آخری حصّہ میں "نقش فرنگ" میں مغربی حکماء کے متعلق نظمیں شامل ہیں۔ جن میں نیطشے، برگساں، ہیگل، ٹالسٹائے[1] بائرن[2] وغیرہ شامل ہیں۔

۱۹۲۷ء میں زبورِ عجم شائع ہوئی۔ جس میں اُن کے فلسفۂ حیات کا عطر موجود ہے۔ یہ کتاب بھی چار حصّوں میں تقسیم کی گئی ہے۔

---

[1] (Count Leo Nikolaievited Tolstoy) ستمبر ۱۸۲۸ء کو روس میں پیدا ہوا۔ ماسکو اور قازان میں تعلیم حاصل کی۔ کچھ عرصہ تک فوج میں ملازمت کرنے کے بعد استعفیٰ دے دیا۔ اور بقیہ عمر ادب و سماج کی خدمت میں بسر کی۔ جرمنی اور اٹلی کا سفر کیا۔ سینٹ پیٹرس برگ کے ادبی ماحول میں کئی شاہکار پیش کئے۔ ۱۸۶۲ء میں شادی کی۔ جنگ کریمیا کے بعد کئی اور ناول شائع کرائے۔ ان ناولوں میں War and Peace اور انا کیرینا (Anna Karenina) کو خاص شہرت حاصل ہوئی۔ آخر میں پکا اشتراکی ہو گیا اور بقیہ تمام عمر غریبوں کی خدمت میں صرف کی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائی۔ تحریریں لکھیں اور گوشہ نشینی اختیار کی۔ ۸ نومبر ۱۹۱۰ء کو وفات پائی۔

[2] (George Gardon Byron) لندن میں ۲۲ جنوری ۱۷۸۸ء کو پیدا ہوا۔ ہیرو اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ The Dream Darkness اس کی مشہور نظمیں ہیں۔ یونانیوں کا ہمدرد اور ترکوں کا بدترین دشمن تھا۔ ۱۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو انتقال کیا۔

پیامِ مشرق خیالات کے اعتبار سے بڑی بلند اور اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے۔ اس میں خودی کے فلسفے کو ایک نئے ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کا ترجمہ بھی ڈاکٹر نکلسن نے کیا ہے۔ جس پر ڈالیشور روسو[1] ڈاکٹر فشر (پروفیسر لنیبرگ یونیورسٹی) اور جرمنی کے ڈاکٹر ہانسی مائنکے نے جرمن میں انتہائی معتبر اور معیاری تبصرے کیے۔

اقبال کی زبورِ عجم اور پیامِ مشرق دونوں کتابوں میں اسرار و رموز کا فلسفہ کافی وضاحتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اور جزوی طور پر دوسرے فلسفیانہ عقائد، اصول و نظریات سے بحث کی گئی ہے۔

ترکی، مصر، انگلستان، جرمنی اور روس وغیرہ ملکوں میں پیامِ مشرق کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ چنانچہ ترکی کے مشہور انشا پرداز حسین دانش نے ایک مضمون پیامِ مشرق پر لکھا جو ترکی کے ایک جریدے میں شائع ہوا۔

مئی ۱۹۲۴ء میں کابل کا سفر اختیار کیا اور وہاں ایک جلسہ میں "ملی ترانہ" پڑھا۔ حکیم سنائی[2] کے مقبرہ کی زیارت کی اور وہیں "مسافر" نظم لکھی۔

---

[1] (Jean Jacques Rousseau) ۱۷۱۲ء میں جینوا میں پیدا ہوا اس کا باپ ایک غریب گھڑی ساز تھا۔ ۱۷۵۰ء میں ۳۸ سال کی عمر میں The Progress of the Art and Scien کے نام سے ایک کتاب شائع ہوئی۔ ۱۷۵۳ء میں اس کی دوسری کتاب The Origine of Unequality Among Man چھپی۔ ان کے علاوہ Tne New Heloise, Social Contract, Emile وغیرہ ایک خاص شہرت رکھتی ہیں۔

(سنائی کا حاشیہ صفحہ ۵۶ پر ملاحظہ فرمایئے)

علامہ اقبالؔ نے سیاسی زندگی میں بھی نمایاں کامیابی حاصل کی۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کے ممبر نامزد کئے گئے۔ انھوں نے کونسل کے مختلف اجلاسوں میں مسلمانوں کی ترقی و فلاح کی عمدہ پیروی کی۔ زمینداروں کے مسائل، انکم ٹیکس اور معاملۂ آراضی میں فرق بتانے کے لئے کونسل کے کئی اجلاسوں میں بڑی مدلّل تقریریں کیں۔ اس کے علاوہ تلوار کو قانون اسلحہ ہند سے مستثنیٰ کرانے اور شراب کی لعنت کو دور کرنے کی تحریکات کو اپنی مدلّل تقریروں سے مضبوط بنایا۔

۲۹۔۱۹۲۸ء میں مدراس کا سفر کیا جہاں ملکی اور قومی مسائل پر تین دن تک متعدد تقریریں کیں۔ ان کی تقریروں کے سلسلے میں مدراس، میسور، بنگلور، وغیرہ کے انگریزی اخباروں نے اداریئے لکھے۔ انجمن ترقی اردو اور ہندی پرچارنی سبھا نے خیر مقدمی محفلیں منعقد کیں۔

۹ جنوری ۱۹۲۹ء کو بنگلور کی مسلم لائبریری کے زیر اہتمام امین الملک دیوان مرزا اسمٰعیل چیف منسٹر میسور کے زیر صدارت ایک عظیم الشان جلسہ میں تقریر کی اور مسلم لائبریری کا معائنہ بھی فرمایا۔

(حاشیہ صفحہ ۵۵ کا) ابوالمجد مجدود ابن آدم سنائی غزنوی بہرام شاہ بن مسعود شاہ غزنوی کے عہد میں پیدا ہوا۔ سنائی بہرام شاہ کا درباری شاعر تھا۔ اس نے ابتدا میں کئی قصیدے بھی لکھے۔ اسکی تصانیف میں مثنوی حدیقہ یا حدیقۃ الحقیقت کو کافی شہرت ملی۔ یہ کتاب ۱۱۳۱ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ مگر بعد میں قصیدہ گوئی ترک کی اور صوفیہ مسلک کی شاعری شروع کی اور بقیہ عمر گوشہ نشینی میں بسر کی (تاریخ ادبیاتِ ایران۔ از آقائی دکتر رضا زادہ شفق صفحہ ۱۲۱۔۱۱۵)

۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کو میسور یونیورسٹی میں بھی تقریر کی ان کی تقریر کے بعد فلسفہ کے ایک غیر مسلم پروفیسر نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں کہا تھا:۔

"ڈاکٹر اقبال کو مسلمان لاکھ اپنا کہیں مگر وہ ہم سب کے ہیں، کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں ۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال انکا ہم مذہب ہے تو ہم ہندوستانیوں کو یہ فخر کم نہیں ہے کہ اقبال ہندوستانی ہے۔"

۱۴ر جنوری ۱۹۲۹ء کو حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہاں بھی کئی جلسوں میں تقریریں کیں۔ ۱۸ر جنوری ۱۹۲۹ء کو نظام کے مہمان ہوئے۔ حیدر آباد، میسور اور مدراس کے موقر جریدوں میں خصوصی مضامین شائع ہوئے۔ اس سلسلے میں میسور کے اخبار "الکلام" کا اقبال نمبر قابلِ ذکر ہے۔

۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ دوازدہ منزل نخاس، کہنہ میں آپ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں حفیظ جالندھری نے شاہنامہ کا وہ حصّہ سنایا جس میں حضرت ابراہیم اور حاجرہ کا واقعہ نظم کیا گیا ہے۔ اس جلسہ میں الہ آباد کے بچوں نے "ملی ترانہ" گایا اور خود اقبال نے بہت اصرار کے بعد فارسی کے چند اشعار سنائے۔

۱۹۳۱ء میں فلسطین میں منعقدہ مؤتمر عالمِ اسلامی میں شرکت کی۔ ۷ر ستمبر سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک گول میز کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں قیام کیا اور پھر ۱۷ر نومبر ۱۹۳۱ء سے ۲۴ر دسمبر ۱۹۳۲ء تک تیسری گول میز کانفرنس میں

شرکت فرمائی اور وہیں سے ۱۹۳۲ء میں "پیرس" گئے جہاں نپولین[1] کے مزار پر بھی وقت گزارا Massigran اور برگساں سے ملاقات کی جب وہ فالج کا شکار تھا۔ دورانِ گفتگو علامہ نے اس حدیثِ نبوی کی طرف اشارہ کیا جس میں زمانہ کو بُرا کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ سن کر وہ بیمار فلسفی اپنی کرسی سے اچھل پڑا۔ ۱۹۳۳ء میں روم (اٹلی) میں مسولینی سے ملاقات کی۔

واپسی میں اسپین اور مصر کی سیر کی۔ اسپین میں انھوں نے کئی نظمیں کہیں جن میں دعا، مسجد قرطبہ، قید خانے میں معتمد کی فریاد عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت، ہسپانیہ، طارق کی دعا، غرناطہ اور دوسری رباعیات شامل ہیں۔ ہسپانیہ میں انھوں نے مسلمانوں کی عظمت پارینہ کا ذکر کرتے ہوئے ۱۴۹۲ء کے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں جب یہ شہر غرناطہ ہسپانیہ کے عیسائی تاجدار فرڈی نینڈ اور اس کی ملکہ ازابلا کے حوالے کیا گیا

---

[1] ۱۵ اگست ۱۷۶۹ء میں پیدا ہوا۔ ۱۷۷۹ء میں پیرس کے فوجی اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۷۸۵ء میں سکنڈ لفٹیننٹ کی حیثیت سے فوجی زندگی شروع کی۔ ۱۸۰۵ء میں جنرل بنا اور روس، آسٹریا اور انگلستان کے خلاف مورچہ لیا۔ ۱۸ مئی ۱۸۰۴ء کو "شہنشاہ" لقب اختیار کیا اور تھوڑے عرصہ میں ہی یورپ کے بیشتر حصہ پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ "روس" سے معرکہ آرائی اس کے لئے مضر ثابت ہوئی۔ ۱۱ اپریل ۱۸۱۴ء کو اپنے لڑکے کے حق میں تخت سے دستبردار ہونا پڑا اور "ایلبا" میں سکونت اختیار کی۔ ۱۸۱۵ء یکم مارچ کو دوبارہ فرانس پر قبضہ جما لیا۔ جس کے خلاف جرمنی اور انگلستان دونوں نے فرانس پر حملہ بول دیا۔ اور اسے واٹرلو کے میدان میں شکست اٹھانی پڑی۔ اور قید و بند کی حالت میں ۵ مئی ۱۸۲۱ء کو وفات پائی۔

"عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت" میں اموی سلطان عبدالرحمٰن اوّل جو الداخل کے لقب سے مشہور ہے۔ جس نے اندلس میں اموی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ مروانی خاندان میں سے خلیفہ ہشام ابن عبدالملک کا پوتا اور اس کے فرزند معاویہ کا بیٹا تھا۔ جس نے بڑی ناز و نعمت میں پرورش پائی تھی جب وہ ابھی ۲۰ سال کا تھا کہ عباسیوں نے اموی سلطنت کا تختہ الٹ دیا اور اس خاندان کے ایک ایک فرد کو تہہ تیغ کر دیا۔ لیکن عبدالرحمٰن ان کے ہاتھوں بچتے بچاتے، مصر و مراقش سے ہوتا ہوا اندلس پہنچ گیا۔ جو اپنی ذہانت اور انتظامی صلاحیتوں کی بنا پر اندلس کا حکمراں ہوا۔ وہ بہت بڑا بہادر، جانباز، مدبّر اور خوش اخلاق تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی کے عہد میں اندلس کی اسلامی حکومت کا عروج ہوا۔ اس نے ملک میں متعدد عمارتیں، شاہراہیں، مسجدیں وغیرہ بنوائیں۔ اس نے قرطبہ کے پاس ایک خاص باغ بنوایا۔ جو "رصافہ" کے نام سے مشہور تھا۔ یہیں اس کا محل تھا۔ اور اسی باغ میں کھجور کا ایک درخت بھی لگایا۔ جسے اقبال نے دیکھ کر ایک ایسی نظم کہی تھی جو کھجور کے استعارے میں عبدالرحمان کی زندگی اور اس کے جد و جہد کے کارناموں کی داستان ہے۔ اور مسلمانوں کو عروج اور سربلندی حاصل کرنے کا ذریعہ بتایا ہے۔ عبدالرحمٰن ۳۲ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۷۴ھ مطابق ۷۹۰ء میں فوت ہوا۔

"قید خانے میں معتمد کی فریاد" میں اندلس کے دور طوائف الملوکی کا ذکر کیا ہے۔ جب اندلس میں بنی اُمیّہ کی سلطنت کو زوال آیا، تو اندلس میں مختلف ریاستیں وجود میں آئیں۔ معتمد بنو عباد کا سب سے بڑا حکمراں تھا جس کا نام

المعتمد علی اللہ تھا۔ لیکن معتمد کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ ۱۰۶۸ء سے ۱۰۹۱ء تک بادشاہ رہا۔ یہ شاعر بھی تھا اور شاعروں کا مربی بھی۔ اسی زمانے میں ہسپانیہ کے عیسائیوں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ مسلمانوں کی باہمی رقابتوں نے اندلس کے بیشتر حصّوں کو کھو دیا۔ معتمد بھی الفانسو کا خراج گزار ہو گیا۔ لیکن الفانسو کے غلط رویّہ اور بہودی سفیر کے ہتک آمیز طریقے نے معتمد کو بھی مشتعل کر دیا اور اس نے سفیر کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ یہ اقدام الفانسو کے لئے ایک چیلنج تھا۔ اس نے معتمد کی ریاست پر حملہ کر دیا اور ایسی صورت میں معتمد نے مراقش کے حکمراں یوسف بن تاشقین کی مدد حاصل کر کے الفانسو کو زلاقہ کے میدان میں ۱۲ رجب ۴۷۹ھ یعنی ۲۲ اکتوبر ۱۰۸۶ء کو بڑی عبرتناک شکست دی۔ لیکن مسلمانوں کی آپسی رقابتیں پھر بھی جاری تھیں کہ یوسف بن تاشقین نے ۱۰۹۱ء میں معتمد کو اشبیلیہ سے مراقش لا کر قید خانے میں ڈال دیا۔ اور اندلس کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ معتمد کی آخری زندگی بڑی عبرت خیز تھی۔ اس کی لڑکیاں سوت کاتتی اور کپڑے بُنتی تھیں۔ اس طرح ان کی اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد بہر طور جی رہے تھے۔ معتمد نے قید خانے ہی میں ۱۰۹۵ء میں وفات پائی۔ معتمد نے قید خانے میں جو اشعار نظم کئے تھے، اس کا اقبالؔ نے ترجمہ بھی کیا تھا۔ اور وہ اشعار انگریزی میں ترجمہ ہو کر "The Bast Series" Wisdom of میں چھپ چکے ہیں۔

اِس سلسلے کی نظموں میں "مسجد قرطبہ" اقبالؔ کے شعری کارناموں میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ ساقی نامہ اقبال کے شعری سانچوں کا دلچسپ نمونہ ہے لیکن مسجد قرطبہ ایک ایسی حسین اور جامع صفت رکھتی ہے جس میں کیف و رنگ

دونوں کی آمیزش ہے۔ محمد عطاء الرب صدیقی لکھتے ہیں :۔

"اِس نظم میں جذبات شدید ہیں۔ یہ شدتِ موج تہہِ آب کی سی ہے۔ اندر تخیلات اور جذبات کے تیز دھارے چل رہے ہیں۔ آپس میں ٹکراتے ہیں اور شوق پیدا کرتے ہیں۔ رستخیز کا عالم ہے۔ لیکن سطح پر چھوٹی چھوٹی لہریں ہیں۔ ان میں وہ روانی تو نہیں، لیکن شمعِ ذاتی کی حد تک شورِ کناں نہیں یا اس کی مثال پھر اس گلخن سے دی جا سکتی ہے، جہاں تہہ میں شعلے ہیں، گرم انتہائی حد تک گرم۔ جس کی برودت کو آسانی سے زائل کر دینے والے لیکن ان کی لہروں کے اوپر سطح پر وہ سرپوش ہے جو آنکھوں کو روشنی اور بینائی کے لئے تکلیف دہ نہیں"۔

(ماہِ نو اپریل ۱۹۵۰ء)

"مسجدِ قرطبہ" مسجد کے صحن ہی میں بیٹھ کر لکھی گئی تھی۔ قرطبہ کے متعلق ایک

۱؎ ۷۸۴ء میں عبدالرحمٰن کے عہد میں خود سلطان نے آٹھویں صدی کے اواخر میں بنیاد رکھی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر میں مشرق و مغرب کی تمدنی میراث کو نہایت خوبی اور سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس مسجد میں سب سے پہلے وہ طاق بنائے گئے، جن کی ساخت عجمی تھی۔ اور نقش و نگار کی وضع بھی ایرانی تھی۔ یہ مسجد سلطان ہشام نے ۹۷۳ء کے عہد میں مکمل کرائی لیکن اس کے بعد بھی نئے سلطان کچھ نہ کچھ اضافے ہی کرتے رہے۔ جیسا کہ عربی مورخ لکھتا ہے :۔

"اِس کے دروں کی تعداد شرقاً اور غرباً انیس شمالاً جنوباً ۳۱ اور اکیس دروازے پیتل کا منقش و مشجر لباس پہنے نمازیوں کا بے تابہ انتظار کر رہے ہیں۔ اور ۱۲۹۳ مطلاً ستون مسجد کے تقدس کو معتقدانہ ادب سے اپنے سروں پر لئے کھڑے ہیں۔ اس کے ستونوں پر قسم قسم کے خوش نما نقش و نگار اور

عربی مورخ لکھتا ہے :-

"قرطبہ بلادِ اندلس میں بمنزلہ عروس کے ہے۔ دنیا بھر کے مذاقِ چشم اور نظر فریب خوبصورتیاں اس میں موجود ہیں۔ اس کے نامور سلاطین کا دراز سلسلہ گویا اس کا زرّیں تاج ہے۔ وہ بے بہا گوہر جو اس کے نازک خیال شاعروں نے بحرِ معانی سے جمع کر کے سلکِ نظم میں منسلک کئے ہیں۔ اس کی مالا بناتے ہیں۔"

(تاریخ اندلس۔ از حامد علی صدیقی ص ۹۸)

سونے اور نیلم سے گلکاری کی ہوئی ہے۔ ۳۰۰ آدمی صرف اس کام پر مامور تھے کہ اگر بتیاں اور عود و عنبر انگیٹھی میں روشن کریں۔"

مسجد کا طول ۶۲۰ فٹ اور عرض ۴۴۰ فٹ تھا۔ جس میں ایک ہزار چار سو سترہ ستون تھے۔ اس کا حاذبہ ایک سو آٹھ فٹ بلند تھا۔ چوٹی پر چاندی اور سونے کے گول دائرے نصب کئے گئے تھے۔ روشنی کے لئے ۲۸۰ بلوری جھاڑ آویزاں تھے۔ سب سے بڑے جھاڑ میں موم کی ۱۴۰ بتیاں جلتی تھیں۔ اس کے علاوہ پیتل کے ۴۲۵ پیالے دیواروں میں لگے ہوئے تھے۔

شاہی مقصورہ کے تمام ستون لاجورد کے، دروازے چاندی اور سونے کے تھے۔ مسجد کا ممبر آبنوس، صندل اور ہاتھی دانت کے چھتیس ہزار (۳۶۰۰۰) ٹکڑوں کو سنہری کیلوں سے جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ جس کی تیاری کی مدّت سات سال تھی۔

مسجد کے مستطیل وضع، مناسب ستونوں کی قطاریں، محرابوں کا سلسلہ وسط صحن میں وضو کا حوض، مسجد کی متوسط بلندی اور اس کے مقابلے میں میناروں کا طول، یہ تمام باتیں صنعت گری اور فن کاریگری کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

۱۹۳۲ء کے سفر کے دوران اقبالؔ نے اندلسؔ میں جو کچھ دیکھا۔ ان میں کھنڈر بھی ہیں اور بچے کھچے محلاتِ شاہی کے نشانات بھی، جنھیں اقبالؔ نے انتہائی جذباتی انداز میں مسجد قرطبہ میں نظم کیا ہے۔ وہ مسجد قرطبہ کے کھنڈر نہ تھے، ماضی کی ایک داستان تھی۔ جیسا کہ ظہیر احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔

"اقبال کی نگاہیں ان کھنڈروں میں بھی رجائیت کا پہلو دیکھ لیتی ہیں۔ عقیدت اور محبت کا جذبہ مسجد قرطبہ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ مسجد قرطبہ اقبالؔ کا شاہکار ہے۔ اگر اقبالؔ کچھ نہ لکھتے اور صرف یہ نظم لکھ دیتے، جب بھی ان کی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوتی اس نظم میں فلسفہ بھی ہے اور تاریخ بھی، آرٹ کا نظریہ بھی ہے اور خود آرٹ کے نمونے بھی۔"

اس نظم میں ۸ بند ہیں۔ اور ہر بند اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔ مثلاً پہلے بند میں زمان و مکاں کا تصور، دوسرے اور تیسرے بند میں عشق کا تصور، چوتھے اور پانچویں بند میں مردِ مومن کی پہچان، چھٹے بند میں اندلسؔ کا ماضی، ساتویں بند میں امید کا تصور اور آٹھویں بند میں مسلسل عمل اور جدوجہد کا تصور ملتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

"سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات"

زمان و مکاں کی نقش گری کے بعد کائنات کی تسخیر کا راز بتلاتے ہیں:۔

"تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات موت ہے میری برات"

پھر کہتے ہیں ؎

"اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا"

پھر عشق کی عظمت کا اظہار مردِ مومن کی شان میں فرماتے ہیں ؎

"مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصل حیات موت ہے اس پر حرام"

آگے چل کر عشق کو وسیع معنوں میں اس طرح استعمال کرتے ہیں ؎

"عشق دمِ جبرئیل عشق دلِ مصطفےٰ[۱۲]
عشق خدا کا رسولؐ عشقِ خدا کا کلام
عشق کے مضراب سے نغمہ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات"

"جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی"

اقبالؔ کا عشق کبھی صدق خلیل کی صورت میں اور کبھی "صبر حسین کی صورت میں اور پھر کبھی "بدر و حنین" کی شکل میں اپنی عظمت کا احساس دلاتا ہے۔ پھر قرطبہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

"اے حرم قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود"

پھر کہتے ہیں ؎

"عرش معلی سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود"

ادب اور آرٹ کو زندگی کے ایک جزو کی حیثیت دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"علم و فن از پیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات"

وہ آرٹ میں بھی حسن صداقت کا پرتو دیکھتے ہیں ؎

"تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود"

پھر آرٹ کے لیے "خلوص" کو ضروری قرار دیتے ہیں: ؎

"رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود"

وہ مسجد قرطبہ کی بلندی اور حسن کو کسی مردِ مومن کے حسن و جلال سے مشابہہ کرتے ہیں ؎

"تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل — وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل
تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار — شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل
تیرے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور — تیرا منارِ بلند جلوہ گہ جبرئیل"

پھر اقبال کا قلم اس مردِ مومن کی یاد دلاتا ہے جو کبھی "مردِ خدا" اور کبھی مردِ کامل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ؎

"ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز"

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اسکا دل بے نیاز

پھر مردِ مومن کی پہچان بتاتے ہیں ؎

"نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز"

پھر "عشق و عقل" کے بہترین امتزاج کی خوبصورت جھلک یوں دکھلاتے ہیں ؎

"عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ"

پھر اندلس کی عظمتِ رفتہ کا گیت گاتے ہیں:-

"جن کے لہو کے طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں"

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں"

پھر اندلس کی زمین اور اس کی خاک میں ایک اضطرابی کیفیت دیکھتے ہیں ؎

روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں"

پھر "دریائے کبیر" پر ایک خواب، مستقبل کا خواب، آنے والے زمانے کا خواب دیکھتے ہیں، شاید یہ خواب حقیقت بن جائے ؎

"عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب"

اقبال نے اپنی یہ شاہکار نظم پہلی بار ۱۹۳۱ء میں جامعہ ملیہ دہلی کے جلسہ میں پڑھی تھی۔

۱۹۳۲ء میں جاوید نامہ شائع ہوا۔ جو ایک طویل فارسی نظم ہے اس میں آسمان کی سیر اور اس کے نتائج نظم کئے گئے ہیں۔ نظم کے ابتدائی بند میں شاعر ایک پہاڑ کے نزدیک کھڑا عالم بے خودی میں رومی کی غزل گنگنا رہا ہے اور پھر رومی عقب سے نکل کر سامنے آجاتے ہیں۔ اور اقبال کو اپنے ساتھ لے کر مختلف سیاروں کی سیر کراتے ہیں اور بڑی بڑی روحوں سے ملاقات کراتے ہیں۔ اقبال کے سوالات اور ان بڑی روحوں کے جوابات اسرار و رموز سے بھرے ہوئے ہیں۔

اُن سے مختلف موضوعات پر مکالموں کے ذریعہ حال و ماضی اور مستقبل کی باتیں ہوتی ہیں اور آخر میں نئی نسل کے لئے دعائیں اور نصیحتیں ملتی ہیں۔

علامہ رومی[1] کے تصورات سے بے حد متاثر تھے۔ اقبال نے بال جبریل کی ایک طویل نظم "پیر و مرید" میں خود کو مرید ہندی اور مولانا رومی کو اپنا پیر و مرشد ظاہر کیا ہے اور ان کو امام عاشقانِ دردمند کے لقب سے یاد کیا ہے۔ پیر و مرید میں مکالموں کے ذریعہ اقبال اپنے دور کے شکوک و شبہات پیش کر کے ان کے جواب چاہتے ہیں۔ وہ مختلف سوالات اہل مشرق کا یورپ سے متاثر ہونا طلبا کا مغربی تہذیب کا دلدادہ ہونا، مغربی عورتوں کا حسین نظر آنا، قوموں کی تنزّلی کے اسباب، آدم کا بھید اور غائت آدم اور جبر و قدر کے مسائل کی صورت میں رومیؔ سے کرتے ہیں اور جگہ جگہ انھیں طرح طرح کے القاب و آداب سے مخاطب کرتے ہیں۔

بال جبریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی، جس میں "زبور عجم" کے انداز کی اردو غزلیں بھی ہیں، "پیام مشرق" کے انداز کی رباعیات بھی۔ ان کے علاوہ بعض ایسی نظمیں ہیں جو اور کسی زبان کے شعر و ادب میں اسی پایہ کی نہیں۔ مثلاً "مسجد قرطبہ"،

---

[1] محمد نام، جلال الدین لقب، بہاء الدین والد کا نام، سلطان العلماء خطاب تھا۔ آپ ۶۰۱ھ مطابق ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء کو "بلخ" میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم والد بزرگوار سے حاصل کی اور پھر مزید تعلیم کے لئے مختلف مقامات کا سفر کیا۔ ۱۸ سال کی عمر میں علوم شرقیہ میں پوری دستگاہ حاصل کر لی۔ شمس تبریز۔ خلیفہ بابا کمال الدین سے بھی استفادہ حاصل کیا۔ ۶۷۲ھ مطابق ۱۷ دسمبر ۱۲۷۳ء میں بمقام قونیہ انتقال فرمایا۔ مثنوی مولانا روم، دیوان رومی، مجموعہ مکاتیب مشہور تصانیف ہیں۔

ذوق و شوق، ساقی نامہ۔

بالِ جبریل میں شامل نظموں کا خلاصہ سرورق والے شعر سے واضح ہے ؎

"اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفسِ سوختہ شام و سحر تازہ کریں"

"ساقی نامہ" بالِ جبریل کا شاہکار ہے۔ حسن جعفری کے قول کے مطابق "بالِ جبریل" میں "ساقی نامہ" کی وہی حیثیت ہے جو جسم میں روح کی"۔

ساقی نامہ میں میخانہ، پیمانہ، مینا و قلقل مینا کے استعارے میں شراب خوری سے جسم ناتواں میں نئی جان پیدا ہوتی ہے۔ خفتہ قوتیں بیدار ہوتی ہیں۔ نبضِ ہستی میں متحرک صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔

ساقی نامہ کا ابتدائی بند فطرت کی عکاسی کرتا ہے: ؎

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — ارم بن گیا دامنِ کوہسار
گل و نرگس و سوسن و نسترن — شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن
فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور — ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور
وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی — اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

پھر زندگی کا پیغام: ؎

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام — سناتی ہے یہ زندگی کا پیام
پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز — کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے — لڑا دے ممولے کو شہباز سے

پھر اصل موضوع کو اس طرح پیش کرتے ہیں: ؎

"زمانے کے انداز بدلے گئے　　نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا　　تماشا دِکھا کر مداری گیا"

پھر مسلمانوں کی گمرہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

"حقیقت خرافات میں کھو گئی　　یہ اُمّت روایات میں کھو گئی
عجم کے خیالات میں کھو گیا　　یہ سالک مقامات میں کھو گیا"

پھر عقل پر عشق کو ترجیح دیتے ہیں:۔

"جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق میری نظر بخش دے"

پھر زندگی کو ابدیت سے معمور فرماتے ہیں:۔

"دمادم رواں ہے یمِ زندگی　　ہر اک شئے سے پیدا دمِ زندگی
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود　　کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی　　فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی"

پھر اسی نظریئے کے مطابق کہ "ارتقائے حیات کی کوئی منزل نہیں" جیسا کہ نیطشے اور رومی سوچتے ہیں، اقبال بھی اپنا کاروانِ فکر آگے لے جاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ نیطشے ارتقائے حیات کی بنیاد ڈارون کی تھیوری Theory پر رکھتا ہے۔ لیکن تکرارِ حیات میں نیطشے، رومی اور اقبال ایک فکر کے مالک ہیں۔ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں:۔

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں　　کہ تُو میں نہیں، اور میں تو نہیں

پھر اقبال نے خودی کے فلسفے سے بحث کی ہے جیسا کہ اسرارِ خودی کے دیباچہ میں لکھا ہے۔ "بلکہ اس کا مفہوم محض احساسِ نفس یا یقین ذات

ہے:

"خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات"

بہرحال شعر اور فلسفہ کا جیسا امتزاج اس نظم میں ملتا ہے۔ "شمع و شاعر" کو چھوڑ کر ان کی تمام شاعری میں نظر نہیں آتا ہے۔

"بالِ جبریل" میں شامل نظموں میں سے کچھ نظمیں گول میز کانفرنس کے سلسلے کی ہیں جو لندن جانے کے پہلے لکھی گئی تھیں۔ پھر اس کے بعد وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو اسپین اور فلسطین میں لکھی گئیں۔ مسجد قرطبہ، لینن[1]، فرمانِ خدا، ذوق و شوق ساقی نامہ، روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے۔ پیر و مرید، تاتاری کا خواب سیاست، ابلیس کی عرضداشت، باغی مرید، چیونٹی اور عقاب جیسی نظمیں اگر بانگِ درا کا تجسس اور اضطراب رکھتی ہیں، تو خودی کے اسرار و رموز کو بے خودی کے اسرار

---

[1] ۱۸۷۰ء میں سمبرک (روس) میں پیدا ہوا۔ سینٹ پیٹرس برگ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا نام Viladimer Ilitch Ulianov تھا۔ باپ اسکول انسپکٹر تھا۔ ۱۸۸۷ء میں اس کے بڑے بھائی کو زار کے خلاف کام کرنے کے جرم میں پھانسی دی گئی۔ جس کی وجہ سے وہ اور بھی زیادہ انقلابی رُخ پر سوچنے لگا۔ ۱۸۹۷ء سے اشتراکی فلسفہ کی ترویج و اشاعت میں اور شدت پیدا ہوئی جس کے پاداش میں ۱۸۹۸ء میں تین سال کے لئے مشرقی سائبیریا بھیج دیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں روس سے فرار ہوا اور ٹراٹسکی کے اشتراک سے ایک رسالہ جاری کیا۔ روس کے انقلاب میں اس کی انقلابی تحریریں اور اشتراکی فکر معاون ثابت ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں ہمیشہ کے لئے زار شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۲۴ء میں مختصر علالت کے بعد فوت ہوا۔

کا بھید بھی کھولنا چاہتی ہیں۔ بقولِ سرور صاحب "گویا ایک طرح کا پیام۔ زبور اور جاوید نامہ کے افکار کا عطر بالِ جبریل میں کھنچ آیا ہے"۔ غزل کے ایک شعر میں فرماتے ہیں:۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے"

فرشتوں کے گیت میں لکھتے ہیں:۔

"اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو"

سرمایہ دارانہ نظام کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات"

اور پھر یہ بھی کہتے ہیں:۔

"ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

"وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدمِ خاکی کہ جو ہے زیرِ سماوات"

مسولینی میں مغربی مریضوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

"تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج"

اپریل ۱۹۳۶ء میں "ضربِ کلیم" شائع ہوئی۔ جس کی بیشتر نظمیں اسلامی روح سے مزین ہیں۔ اِن نظموں کے ذریعہ انھوں نے نئی تہذیب پر خوب خوب چوٹیں کی ہیں۔ ضربِ کلیم اقسام مضامین کے لحاظ سے چھ حصّوں میں منقسم ہے۔

(۱) متفرقات (۲) تعلیم و تربیت (۳) عورت (۴) ادبیات، فنونِ لطیفہ (۵) سیاسیاتِ مشرق و مغرب (۶) محرابِ گل، افغان کے افکار۔

اِن حصّوں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو مجموعی طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ پہلے حصّہ کی زیادہ تر نظمیں فقر و ایمان، قوتِ دین، مدنیت، اسلام و تمدّن مغرب، مسلمانوں کی پستی و زوال اور مسئلہ اجتہاد وغیرہ موضوعات سے بحث کرتی ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

"مقامِ فکر ہے پیمائشِ زمین و مکاں
مقامِ ذکر ہے سُبحانَ رَبیَّ الاَعلیٰ

یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار
شریکِ شورشِ پنہاں نہیں کچھ بھی نہیں

قوم کیا چیز ہے قوموں کی امامت کیا ہے
اسکو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

عناصر اسکے ہیں رُوح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اُن کے نظریہ کے مطابق :ے

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبال زندگی کو حرکی مانتے ہیں۔ وہ اپنے اس تصور کو سلطان ٹیپو کی وصیت میں یوں پیش کرتے ہیں :۔

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

انھیں یقین ہے کہ خودی سے اس زندگی میں ولولہ، جوش اور روح

کلیمی جاگ اٹھتی ہے اور اس کی اہمیت کے پیش نظر فرماتے ہیں: ؎

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جزام

اس کے علاوہ متعدد اشعار میں اپنے اسی نظریے کی وضاحت کرتے ہیں جس سے اقبال عبارت ہے: ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

ہزار بار حکیموں نے اس کو سمجھایا
مگر یہ مسئلہ زن رہا وہیں کا وہیں

مقصود ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا؟

اقبال کے یہاں موت کے آخری لمحے تک وطن دوستی قوم پرستی کے جذبات متحرک تھے۔ اس سلسلے میں ایک نظم "شعاعِ امید" ہے ؎

خاور کی اُمیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُر نایاب

ضربِ کلیم کے پانچویں موضوعات کے تحت مغربی تہذیب سے بیزاری یورپ کی ملوکیت، اشتراکیت اور فاشزم میں ایک گھٹن سی محسوس کرتے ہیں۔ انھوں نے عالمی سیاست کو بہت حکیمانہ نقطۂ نظر سے دیکھا ہے۔ فلسطین اور اندلس کے مسئلے پر کہتے ہیں: ؎

ہے خاکِ فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

اسی طرح "ابلیس سینا" میں فرماتے ہیں: ؎

تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارتگری جہاں میں ہے اقوام کی معاش

ہر گرگ کو ہے برّہ معصوم کی تلاش

اس کے بعد دوسری نظمیں بھی اپنا ایک فکری اور منفرد لب و لہجہ رکھتی ہیں، مثلاً تصوّف، مومن، شاعر، مرد مسلمان، فقر و ملوکیت، مغنیٔ کردار، ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام، دین و منبر، فنونِ لطیفہ، ہندی مکتب وغیرہ۔ ان کے آخری باب کی نظموں میں وہ نظم بھی قابلِ تحسین ہے جو پشتو کے مشہور گیت "واقربان" کے دھن میں لکھی گئی ہے:

رومی بدلے، شامی بدلے، بدلا ہندوستان
تو بھی اے فرزندِ کہستان اپنی خودی پہچان
اپنی خودی پہچان او غافل افغان

موسم اچھا پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا وہ کیسا دہقان
اپنی خودی پہچان او غافل افغان

۱۹۳۶ء میں "پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق" شائع ہوئی۔ اس میں آپ نے ہندوستانیوں کے مابین عدم رواداری اور نااتفاقی پر آنسو بہائے ہیں۔

"ارمغانِ حجاز" اقبال کا آخری تحفہ ہے۔ اخوتِ انسانی کا لامتناہی جذبہ اس میں شامل شدہ رباعیات میں شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے:

جہاں مہر و ماہ زنّاریٔ دل
گشاد ہر گرہ از زاریٔ دل
پیامے دہ زمن ہندوستاں را
غلام آزاد از بیداریٔ دل

علامہ کو کشمیر سے بڑی محبت تھی۔ چنانچہ انگلستان کی واپسی کے بعد کشمیری انجمن اور آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ انھیں کشمیر کی غربت اور ان کے حالات سے گہری ہمدردی تھی۔ "باغ نشاط" میں لکھتے

ہیں: ؎ (یہیں انھوں نے ۱۹۲۰ء میں ساقی نامہ لکھا)

کشیری کہ با بندگی خو گرفتہ
بتے مے تراشد ز سنگ مزارے

ضمیرش تہی از خیال بلندے
خودی نا شناسے ز خود شرمسارے

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے

نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینۂ او دل بے قرارے

ازاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے

غنیؔ کاشمیری کے عادات واطوار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ؎

غنی آں سخن گوئے بلبل صفیر
نوا سنج کشمیر مینو نظیر!

چو اندر سرا بود در بستہ داشت
چو رفت از سرا تختہ را وا گذاشت

یکے گفتش اے شاعرے دل رسے
عجب دارد از کار تو ہر کسے

بہ پاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر
فقیر و بہ اقلیم معنی امیر

ز من آنچہ دیدند یاراں رواست
درین خانہ جز من متاع کجاست

غنی نا شنیدہ کاشانہ اش
متاع گرانے است در خانہ اش

چو آں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازیں ہیچ کاشانہ نیست

؎ مرزا محمد طاہر غنیؔ کاشمیری تلمیذ شیخ محسن فانی۔ ایک خاص طرز فکر رکھنے والا شاعر تھا۔ اس کے کلام میں رنگین بیانی کے ساتھ ساتھ تکلف آرائی بھی ہے۔ اس نے اپنی مثالیہ نگاری سے فارسی شاعری کو ایک نئے رنگ سے آشنا کیا۔ شبلی کے قول کے مطابق غنی نے مثالیہ نگاری کو مبالغہ آرائی کے توسط سے ایک خاص فنی بنا کر پیش کیا۔ غنیؔ نے طاہر تخلص کا بھی استعمال کیا ہے۔ ۱۶۶۸ء میں فوت ہوا اور ایک دیوان یادگار چھوڑ گیا۔

ایک اور نظم میں کشمیر کی تعریف فرماتے ہوئے کہتے ہیں :-

رخت بہ کاشمیر کُشا کوہ و تل و دمن نگر
سبزہ جہاں جہاں بہ بیں لالہ چمن چمن نگر

بادِ بہار موج موج مرغ بہار فوج فوج
صُلصُل و سار زوج زوج بر سر نارون نگر

زخمہ بہ تار ساز زن بادہ بہ ساتگین بریز
قافلۂ بہار را انجمن انجمن نگر

جنوری ۱۹۳۸ء میں نہرو لاہور تشریف لے گئے تو اُن سے ......

ملاقات کی اور ملک کے سیاسی مسئلوں پر گفتگو کی۔ اکتوبر ۱۹۳۱ء میں افغانستان کی سیاحت کی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے ۴ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ اکتوبر ۱۹۳۵ء میں حالیؔ کی برسی پر پانی پت کا سفر کیا۔ ۹ر جنوری ۱۹۳۸ء کو انٹر کالجیئیٹ مسلم برادرہڈ نے یوم اقبالؔ کا انعقاد کیا۔ ان کا آخری مجموعہ ارمغانِ حجاز وفات کے بعد شائع ہوا۔

علامہ آخری زمانہ میں گھر سے باہر کم نکلنے لگے تھے۔ ذاتی کوٹھی واقع میورروڈ بہ نام جاوید منزل قیام پذیر تھے۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۵ء تک تو وہ بھاٹی دروازہ میں قیام کیا۔ پھر وہاں سے انار کلی چلے گئے۔ جہاں تقریباً ۱۲-۱۳ سال رہنے کے بعد ۱۹۲۲ء میں میکلوڈ روڈ منتقل ہوئے۔ جہاں ۱۹۳۵ء تک قیام رہا۔ اور پھر آخری زمانہ میں جاوید منزل میں اٹھ آئے تھے۔ ملنے والے تو آتے رہتے تھے اور شام کو اچھی خاصی محفل جمی رہتی تھی۔ اُن کے مکان کا نقشہ عنایت اللہ صاحب نے یوں کھینچا ہے :-

"مکان کے صحن میں چارپائی بچھی ہے اس پر علامہ تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ رنگت سُرخ و سپید بھرا ہوا جسم، پتلے پتلے ہونٹ، ناک

نہ بہت چھوٹی نہ بہت بڑی، پیشانی فراخ، آنکھیں روشن جو بہت ... سوچتے رہنے کی وجہ سے اندر کی طرف دھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ لباس صرف ایک سفید کرتہ اور تہہ بند، سامنے حقہ پڑا ہے۔ ارد گرد کرسیاں ہیں۔ سیاست، مشاعرہ، فلسفہ، مذہب، مگر جس مضمون پر گفتگو چھڑ گئی، اقبال گھنٹوں باتیں کئے جا رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا ایک سیلاب ہے کہ برابر امنڈا آ رہا ہے۔ اگرچہ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں لیکن ان کی یہ عادت نہیں تھی کہ جب کوئی نیا ملنے والا آئے تو اس سے کرید کرید کر حالات پوچھیں اور بات کرنے کا خواہ مخواہ کوئی موقعہ ڈھونڈیں... وہ آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتے تھے اور ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ خود ہی باتیں کئے جائیں اور کسی کو کچھ کہنے سننے کا موقعہ نہ دیں.... عام طور پر وہ پنجابی میں باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی اردو بھی بولتے تھے۔ مشکل مضمون ہو تو انگریزی میں ادا کر دیتے تھے.... باتیں کرتے کرتے کوئی لطیفہ سوجھ جاتا تھا تو بڑی بے تکلفی سے بیان کر دیتے تھے۔ لیکن خدا نے ان کو ہر بات کے بیان کرنے کا ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کسی موقعہ پر بھی وہ تہذیب کے دائرے سے نہیں نکلتے تھے.... رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انھیں سچا عشق تھا۔ حضورؐ کا نام آتے ہی بے اختیار رو پڑتے تھے۔ کوئی حدیث بیان کرنے لگتے تھے تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ قرآن سن کر انکی عجیب حالت ہوتی تھی..... اقبال کو دنیاداری کے ڈھنگ نہیں آتے تھے۔

جو بات دل میں ہوتی تھی کسی جھجک کے بغیر صاف صاف کہہ دیتے تھے...
....وہ ایک دفعہ جو رائے قائم کر لیتے تھے اسے آسانی سے نہیں بدلتے تھے۔ مگر جب انھیں معلوم ہو جاتا تھا کہ اُن کی رائے صحیح نہیں تو اس پر اصرار بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بحث کا انداز نہیں ہوتا تھا.... ایسا اتفاق کبھی کبھی ہی ہوتا تھا کہ انھوں نے کوئی چیز خود خریدی ہو ورنہ ان کے پہننے کے کپڑے تک دوسرے لوگ ہی پسند کرتے تھے۔ جیسا موٹا چھوٹا کسی نے لاکر دیا پہن لیا۔ ہاں وہ کھانا اچھا کھاتے تھے۔ شبدیگ، پلاؤ اور سیخ کے کباب انھیں بہت پسند تھے۔ پھلوں میں آم بہت پسند تھا۔ ابتدا میں وہ شلوار اور کرتہ پہنتے تھے۔ سر پر سپید پگڑی ہوتی تھی..... ولایت سے آنے کے بعد وہ عام طور پر شلوار، قمیض اور فراق کوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے تھے۔ کبھی کبھی کوٹ پتلون بھی پہن لیتے تھے۔ تو اس کے ساتھ بھی ہیٹ کی جگہ ترکی ٹوپی ہوتی تھی..... خطوں کا جواب بڑی باقاعدگی سے دیتے تھے۔ ان کا خط بڑا پاکیزہ اور خوبصورت تھا.... تھیٹر، سینما، کھیل تماشوں کا بھی انھیں شوق نہیں تھا۔ زندگی بھر میں انھوں نے صرف ایک دفعہ سینما دیکھا تھا۔ وہ اکثر مشاعروں میں شریک ہوتے رہتے تھے۔ لیکن بعد میں انھوں نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا تھا.... کتابوں میں بھی وہ کتابیں پڑھتے تھے جو اُن کے ڈھب کی ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی دو مدت تک شعر نہیں کہتے تھے۔ لیکن جب شعر کہنے پر طبیعت آتی

تھی تو بیٹھے بیٹھے بیسوں شعر کہہ ڈالتے تھے۔"

اِس مذکورہ اقتباس سے اُن کے لباس وطعام، طور وطریق، گفتگو کا انداز، سادگی وطہارت، مذہب پسندی، شعر کہنے کے اوقات، کتابوں کے انتخاب، وضع وقطع وغیرہ کے متعلق مفید اطلاعات ملتی ہیں۔

علامہ مذہبی فکر کے ساتھ ساتھ اسلامی طرز زندگی کو پسند فرماتے تھے۔ وہ نماز اور قرآن پابندی سے پڑھتے تھے۔ ان کے روزانہ کے معمول میں صبح اٹھ کر نماز پڑھنا اور نماز کے بعد اونچی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت کرنا، پھر ورزش کرنا اور غسل کے بعد کالج جانا اور دوپہر کو کالج سے آکر کھانا کھانا شامل تھا۔ چائے، سگریٹ کے شوقین نہیں تھے۔ اگر کبھی چائے پینے کی خواہش ہوئی تو نمکین چائے پیتے تھے۔ راتوں میں اٹھ کر تہجد پڑھتے تھے۔ شام کے ناشتے میں پکا ہوا ایک پیالہ دودھ کافی تھا۔

۱۹۳۴ء میں وہ گلے کے عارضے میں مبتلا ہوئے۔ جس کا ذکر عنایت اللہ صاحب نے اِس طرح کیا ہے:۔

"وہ عید کی نماز پڑھ کر آئے اور گرم دودھ ڈال کر سوئیاں کھالیں۔ سوئیاں کھاتے ہی ان کی آواز بیٹھ گئی۔ بہتیرا علاج کیا کوئی فائدہ نہیں ہوا جب گلے کی تکلیف بڑھ گئی تو انھوں نے ہائی کورٹ بھی جانا چھوڑ دیا۔"

اس نئی بیماری کی ابتدا عید کے دن یعنی ۱۰ر جنوری ۱۹۳۴ء سے ہوئی جیسا کہ اوپر عنایت اللہ صاحب کا مذکور ہوا۔ ان کے علاوہ علامہ نذیر نیازی نے

بھی اس واقعہ کی شروعات پر یوں بیان دیا ہے کہ:-

"علامہ عید کی نماز پڑھنے چودھری محمد حسین، جاوید اقبال اور اپنے ملازم علی بخش کے ساتھ شاہی مسجد گئے اس دن خاص طور سے ٹھنڈک میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ علامہ شلوار اور کوٹ، زیب تن کیے ہوئے تھے۔ مسجد میں کافی دور تک ننگے پاؤں بھی چلنا پڑا تھا۔ مسجد سے واپسی پر دہی اور سوئیاں کھائیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عید کے دوسرے ہی دن سخت نزلے کی شکایت ہو گئی۔ نزلے کا علاج ہوا لیکن فائدہ کچھ بھی نہیں ہوا۔"

چنانچہ سر راس مسعود کے مشورے پر ۳۱ جنوری ۱۹۳۵ء کو بھوپال تشریف لے گئے۔ راستے میں ۳۰ جنوری کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے جلسہ میں جو خالدہ ادیب خانم کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا۔ تقریر کی اور بذریعہ پنجاب میل بھوپال پہنچے اور ریاض منزل میں قیام فرمایا۔ اور بجلی کے ذریعہ (ULTRA RAY) علاج شروع ہوا اور افاقہ ہونے پر نیازی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "الحمد للہ خیریت ہے۔ کھانسی کی شکایت اب باقی نہیں رہی۔" ۱۳ فروری ۱۹۳۰ء کے خط میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ "بجلی کا علاج ابھی صرف چار دفعہ ہوا ہے کچھ خفیف سا فرق آواز میں ہے مگر زیادہ وضاحت سے آٹھ دس دفعہ علاج کے بعد معلوم ہوگا اس لیے آپ حکیم صاحب والی دوا ارسال نہ کریں۔"

علامہ ۸ مارچ کو بھوپال سے ۱۷ مہینہ کے قیام کے بعد لاہور تشریف لے گئے۔ شیخ عبدالقادر ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"مرحوم اپنی عمر کے آخری سالوں میں معمولی بات چیت بھی بہت دھیمی آواز سے کر سکتے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں جب میں لاہور سے انگلستان روانہ ہوا تو اقبال بیمار تھے۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ آکسفورڈ نہ آسکے جہاں انھیں لیکچر دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔"

اسی درمیان آپ کی رفیقۂ حیات، والدہ جاوید سردار بیگم ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو انتقال فرما گئیں۔ جس کا اثر قلب پر بے حد شدید تھا اور اس کے قبل ۹ نومبر ۱۹۱۴ء میں آپ کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا۔ ۱۷ اگست ۱۹۳۰ء کو والد بزرگوار نے رحلت کی اور والدہ آفتاب اقبال (مختار بیگم) ۲۱ نومبر ۱۹۱۴ء کو فوت ہوئیں۔ ان پے در پے صدمات نے ان کے قویٰ کو مضمحل کر دیا تھا۔ نظر کافی کمزور ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں انھیں موتیا بند کی شکایت میں شدت پیدا ہو گئی۔

۱۹۳۱ء میں درد گردہ کی شکایت دوبارہ عود کر آئی۔ اس کے قبل ۱۹۱۷ء میں پہلی مرتبہ انھیں درد گردہ کی شکایت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ لالہ لاجپت رائے اور سید نذیر احمد نیازی کے مشورے پر حکیم نابیناؒ عبدالوہاب انصاری

؎ آغاز ہیور کے مشہور انصاری خاندان کے رکن تھے۔ ۱۹۱۹ء میں ۱۲ سال کی عمر میں بینائی چلی جانے کے بعد دیوبند سے طب کی سند لی۔ اور دلی میں مطب شروع کیا۔ آپ کے چچا شاہ عبدالغفور دلی کے مشہور حکیم تھے۔ جنھیں نظام دکن شیخ الرئیس ثانی کہتے تھے۔ دلی سے حیدرآباد گئے اور وہاں تقریباً ۵۰ سال تک قیام کیا۔ میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں کے شاہی معالج تھے۔ ۱۹۳۶ء میں دلی واپس آئے۔ ۱۹۳۸ء میں نظام نے دوبارہ حیدرآباد بلایا۔ ۱۹۳۹ء میں حج کیا اور واپسی میں دلی میں مطب شروع کیا۔ (بقایا صفحہ ۸۴ پر)

برادر ڈاکٹر انصاری کا علاج شروع کرایا۔

دسمبر ۱۹۳۷ء میں قلب بھی کافی کمزور ہو گیا تھا۔ حکیم نابینا کا علاج ہوا۔ حیدر آباد سے دوائیں آئیں۔ کوئی فائدہ کی صورت نظر نہیں آئی۔ حکیم محمد حسن قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور نے بھی چند دوائیں تجویز کیں مگر سب بیکار ثابت ہوئیں۔ آپ کے بڑے بھائی شیخ محمد عطا سے ان کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اقبال نے انھیں ایک دن آبدیدہ دیکھ کر فرمایا:۔

"کیا آپ کا خیال ہے کہ اقبال مر جائے گا لیکن موت ایسی چیز تو نہیں کہ اس پر آنسو بہائے جائیں۔ میں مسلمان ہوں مرنے سے نہیں ڈرتا۔"

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم لکھتے ہیں:۔

ڈاکٹر صاحب چھوٹے کمرے میں حسب معمول چارپائی پر لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ لیکن ان کے چہرے پر وہ شگفتگی نہ تھی جو اکثر آشنا صورتوں کو دیکھنے سے پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اس دن ہوئے تھے ہمیں دیکھتے ہی یوں محسوس ہوا جیسے اچانک چونک پڑے ہوں.... اس روز عرشی کی جو پنجابی نظم اس نوجوان نے سنائی تھی، بہت خوب تھی.... وہ کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ ڈاکٹر یوسف صاحب تشریف لائے اور ابھی وہ معائنے میں مصروف ہی تھے کہ شفاء الملک حکیم قرشی بھی آ پہنچے، دونوں نے باہم مشورہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے

(بقیہ صـ ۸۳ کا) اور وفات تک دلی نہ چھوڑی۔ ۶ مئی ۱۹۴۱ء کو وفات پائی اور گنگوہ (سہارنپور) میں دفن ہوئے۔

استخراج بھی کیا گیا۔ کچھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوئیں... ڈاکٹر صاحب یونانی علاج کا تذکرہ کرنے لگے۔ میں ہمیشہ سے ان کا قائل ہوں لیکن اب کے تو یقین ہو گیا ہے کہ ان دوائیوں میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ انسان تندرست ہو نہ ہو ذہنی طور پر صحت یاب ضرور ہو جاتا ہے۔ یہ کم بخت مرض کی تلخی کو بھی "خوشگوار" بنا دیتی ہیں۔ شاید اتنے شدید مرض کے باوجود میرے زندہ رہنے کی یہی وجہ ہے۔ اس پر وہ یک لخت خاموش ہو گئے۔ لمحے بھر کے بعد اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے، "یہ لوگ کہتے تو ہیں میں تندرست ہو رہا ہوں لیکن یہ خواب اب ختم ہوتا نظر آتا ہے۔" یہ بات کچھ ایسے غمناک لہجہ میں کہی گئی کہ ہم سب دم بخود ہو کر رہ گئے۔ ان کے دیرینہ خادم علی بخش کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ کسی نے کہا کیوں روتا ہے کوئی فکر کی بات نہیں۔ ڈاکٹر صاحب لیٹ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا:۔ اُسے مت روکو آخر ۳۰ سال کا ساتھ ہے جُدا ہوتے تکلیف ہوتی ہے۔" ہم واپس ہو گئے۔" اس کے بعد میری قسمت میں ان کی ملاقات کی بجائے ان کو کندھا دینا تھا..."[1]

۲۰ اپریل ۱۹۳۸ء کی رات حالت زیادہ خراب ہوئی تو ڈاکٹروں کے بھی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس رات ۳ بجے تک سوتے رہے پھر جاگے تو طبیعت گھبرانے لگی۔ ۲۱ اپریل کو ۴ بجے صبح پاؤں پھیلا دیئے۔ پھر آنکھیں اوپر کی طرف اٹھائیں۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے: "اللہ یہاں درد ہے۔" اِن کا پرانا خادم علی بخش اس

---

[1] ماہِ نو۔ ستمبر ۱۹۵۳ء

وقت ان کے پاس تھا اس نے بایاں ہاتھ اُن کے دِل پر رکھا اور اپنے داہنے ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ اتنے میں انھوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ منہ خود بخود قبلہ کی طرف پھر گیا اور دُنیا کو چھوڑ کر سفر آخرت اختیار کیا۔

"صدق اخلاص وفا باقی نماند"

۱۹۳۸ء

(مصرع اقبالؔ)

"معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود"

ہمالہ

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ سوزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

امتحانِ دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو، دیوارِ ہندوستاں ہے تو
مطلعِ اوّل فلک جسکا ہو وہ دیواں ہے تو
سوئے خلوت گاہِ دل دامن کشِ انساں ہے تو
برف نے باندھی ہے دستارِ فضیلت تیرے سر
خندہ زن ہے جو کلاہِ مہرِ عالمتاب پر

تیری عمرِ رفتہ کی اک آن ہے عہدِ کہن
وادیوں میں ہیں تری کالی گھٹائیں خیمہ زن
چوٹیاں تیری ثریا سے ہیں سرگرمِ سخن
تو زمیں پر اور پہنائے فلک تیرا وطن
چشمۂ دامن ترا آئینۂ سیّال ہے
دامنِ موج ہوا جس کے لیے رومال ہے

ابر کے ہاتھوں میں رہوارِ ہوا کے واسطے
تازیانہ دے دیا برقِ سرِ کہسار نے
اے ہمالہ کوئی بازی گاہ ہے تو بھی جسے
دستِ قدرت نے بنایا ہے عناصر کے لیے
ہائے کیا فرطِ طرب میں جھومتا جاتا ہے ابر
فیلِ بے زنجیر کی صورت اڑا جاتا ہے ابر

جنبشِ موجِ نسیمِ صبح گہوارہ بنی ہے — جھومتی ہے نشۂ ہستی میں ہر گل کی کلی
یوں زبانِ برگ سے گویا ہے اسکی خامشی — دستِ گلچیں کی جھٹک میں نے نہیں دیکھی کبھی

کہہ رہی ہے میری خاموشی ہی افسانہ مرا
کنجِ خلوت خانۂ قدرت ہے کاشانہ مرا

آتی ہے ندّی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی — کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرماتی ہوئی
آئینہ سا شاہدِ قدرت کو دکھلاتی ہوئی — سنگِ رہ سے گاہ بچتی گاہ ٹکراتی ہوئی

چھیڑتی جا اس عراقِ دلنشیں کے ساز کو
اے مسافر! دل سمجھتا ہے تری آواز کو

لیلیٰ شب کھولتی ہے آکے جب زلفِ سیاہ — دامنِ دل کھینچتی ہے آبشاروں کو صدا
وہ خموشی شام کی جس پر تکلّم ہو فدا — وہ درختوں پر تفکّر کا سماں چھایا ہوا

کانپتا پھرتا ہے کیا رنگِ شفق کہسار پر
خوشنما لگتا ہے یہ غازہ ترے رخسار پر

اے ہمالہ! داستاں اس وقت کی کوئی سنا — مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ بتا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا — داغ جس پر غازۂ رنگِ تکلف کا نہ تھا

ہاں دکھا دے اے تصوّر! پھر وہ صبح و شام تو
دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

مرزا غالبؔ

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
آہ! تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر[1] میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

---

[1] جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے۔

لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں
ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستاں کی سرزمیں آہ! اے نظارہ آموزِ نگاہ نکتہ چیں
گیسوئے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

صدائے درد

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

جسکے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجۂ ساحل سے گھبراتا ہوں میں

دانۂ خرمن نما ہے شاعرِ معجز بیاں
ہو نہ خرمن ہی تو اس دانے کی ہستی پھر کہاں

حسن ہو کیا خود نما جب کوئی مائل ہی نہ ہو
شمع کو جلنے سے کیا مطلب جو محفل ہی نہ ہو

ذوقِ گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینہ سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

کب زباں کھولی ہماری لذتِ گفتار نے
پھونک ڈالا جب چمن کو آتشِ پیکار نے

آفتاب

(ترجمہ گاتیری)

اے آفتاب! روح و روانِ جہاں ہے تو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تو

باعث ہے تو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا

قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے

ہر شے کو تیری جلوہ گری سحر ثبات ہے
تیرا یہ سوز و ساز سراپا حیات ہے

وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے، خرد ہے، روحِ رواں ہے، شعور ہے

اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز، تو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو

تیرا کمال ہستیٔ ہر جان دار ہیں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار ہیں

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اوّل و آخر ضیا تری

ایک آرزو

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یارب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈوبتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

مرتا ہوں خامشی پر یہ آرزو ہے میری
دامن میں کوہ کے اک چھوٹا سا جھونپڑا ہو

آزاد فکر سے ہوں عزلت میں دن گزاروں
دنیا کے غم کا دل سے کانٹا نکل گیا ہو

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشموں کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو

گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجکو جہاں نما ہو

ہو ہاتھ کا سرہانا سبزہ کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت خلوت میں وہ ادا ہو

مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اسکے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

آغوش میں زمیں کی سویا ہوا ہو سبزہ
پھر پھر کے جھاڑیوں میں پانی چمک رہا ہو

پھولوں کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

مہندی لگائے سورج جب شام کی دلہن کو
سُرخی لئے سنہری ہر پھول کی قبا ہو

راتوں کو چلنے والے رہ جائیں تھک کے جس دم
اُمید ان کی میرا ٹوٹا ہوا دیا ہو

بجلی چمک کے ان کو کٹیا مری دکھا دے
جب آسماں پہ ہر سُو بادل گھرا ہوا ہو

پچھلے پہر کی کوئل، وہ صبح کی مؤذن
میں اس کا ہمنوا ہوں، وہ میری ہمنوا ہو

کانوں پہ ہو نہ میرے دیر و حرم کا احساں
روزن ہی جھونپڑی کا مجھکو سحر نما ہو

پھولوں کو آئے جس دم شبنم وضو کرانے
رونا مرا وضو ہو، نالہ مری دعا ہو

اس خامشی میں جائیں اتنے بلند نالے
تاروں کے قافلے کو میری صدا درا ہو

ہر درد مند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

تصویرِ درد

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے زباں میری

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

ٹپک اے شمع، آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

الٰہی! پھر مزا کیا ہے یہاں دنیا میں رہنے کا؟
حیاتِ جاوداں میری نہ مرگِ ناگہاں میری

اڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

مرا رونا نہیں، رونا ہے یہ سارے گلستاں کا — وہ گل ہوں میں، خزاں ہر گل کی ہے گویا خزاں میری

"دریں حسرت سرا عمریست افسونِ جرس دارم
زنفیضِ دل طپیدن ہا خروشِ بے نفس دارم"

ریاضِ دہر میں نا آشنائے رسمِ عشرت ہوں — خوشی روتی ہے جس کو، میں وہ محرومِ مسرت ہوں
مری بگڑی ہوئی تقدیر کو روتی ہے گویائی — میں حرفِ زیرِ لب شرمندۂ گوشِ سماعت ہوں
پریشاں ہوں میں مشتِ خاک، لیکن کچھ نہیں کھلتا — سکندر ہوں کہ آئینہ ہوں یا گردِ کدورت ہوں
یہ سب کچھ ہے مگر ہستی مری مقصد ہے قدرت کا — سراپا نور ہو جسکی حقیقت، میں وہ ظلمت ہوں
خزینہ ہوں چھپایا مجھ کو مشتِ خاکِ صحرا نے — کسی کو کیا خبر ہے میں کہاں ہوں کس کی دولت ہوں
نظیری نہیں ممنونِ سیرِ عرصۂ ہستی — میں وہ چھوٹی سی دنیا ہوں کہ آپ اپنی ولایت ہوں
نہ صہبا ہوں، نہ ساقی ہوں، نہ مستی ہوں نہ پیمانہ — میں اس میخانۂ ہستی میں ہر شے کی حقیقت ہوں

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے
وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں — کہ بامِ عرش کے طائر ہیں میرے ہمزبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنونِ فتنہ ساماں کا — مرا آئینہ دل ہے قضا کے رازدانوں میں
رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دیدیا گویا — لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں
نشانِ برگِ گل تک بھی نہ چھوڑا باغ میں گلچیں — تری قسمت سے رزمِ آرائیاں ہیں باغبانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے — عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
سُن اے غافل صدا میری، یہ ایسی چیز ہے جسکو — وظیفہ جان کر پڑھتے ہیں طائر بوستانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اسکو جو کچھ ہو رہا ہے، ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہدِ کہن کی داستانوں میں

یہ خاموشی کہاں تک لذتِ فریاد پیدا کر
زمیں پر تو ہو اور تیری صدا ہو آسمانوں میں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہی آئینِ قدرت ہے، یہی اسلوبِ فطرت ہے
جو ہے راہِ عمل میں گامزن، محبوبِ فطرت ہے

ہویدا آج اپنے زخمِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا
لہو رو رو کے محفل کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا

جلانا ہے مجھے ہر شمعِ دل کو سوزِ پنہاں سے
تری تاریک راتوں میں چراغاں کر کے چھوڑوں گا

مگر غنچوں کی صورت ہوں دلِ درد آشنا پیدا
چمن میں مشتِ خاک اپنی پریشاں کر کے چھوڑوں گا

پرونا ایک ہی تسبیح میں اِن بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

مجھے اے ہمنشیں رہنے دے شغلِ سینہ کاوی میں
کہ میں داغِ محبت کو نمایاں کر کے چھوڑوں گا

جو ہے پردوں میں پنہاں چشمِ بینا دیکھ لیتی ہے
زمانے کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

کیا رفعت کی لذت سے نہ دل کو آشنا تو نے
گزاری عمر پستی میں مثالِ نقشِ پا تو نے

رہا دل بستۂ محفل مگر اپنی نگاہوں کو
کیا بیرونِ محفل سے نہ حیرت آشنا تو نے

فدا کرتا رہا دل کو حسینوں کی اداؤں پر
مگر دیکھی نہ اس آئینے میں اپنی ادا تو نے

تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

سراپا نالۂ بیداد سوزِ زندگی ہو جا
سپندِ آسا گرہ میں باندھ رکھی ہے صدا تو نے

صفائے دل کو کیا آرائشِ رنگِ تعلق سے
کفِ آئینہ پر باندھی ہے او ناداں! حنا تو نے

زمیں کیا آسماں بھی تیری کج بینی پہ روتا ہے
غضب ہے سطرِ قرآں کو چلیپا کر دیا تو نے

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل
بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

کنوئیں میں تو نے یوسف کو جو دیکھا بھی تو کیا دیکھا
ارے غافل! جو مطلق تھا مقیّد کر دیا تو نے

ہوس بالائے منبر ہے تجھے رنگیں بیانی کی!
نصیحت بھی تری صورت ہے اک افسانہ خوانی کی

دکھا وہ حسنِ عالم سوز اپنی چشمِ پُرنم کو
جو تڑپاتا ہے پروانے کو رُلواتا ہے شبنم کو

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس! مقصد نہیں اسکا
بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشمِ آدم کو

اگر دیکھا بھی اُس نے سارے عالم کو تو کیا دیکھا
نظر آئی نہ کچھ اپنی حقیقت جام سے جم کو

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اُس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنّت سے نکلواتا ہے آدم کو

نہ اٹھا جذبۂ خورشید سے اک برگِ گل تک بھی
یہ رفعت کی تمنّا ہے کہ لے اُڑتی ہے شبنم کو

بھرا کرتے نہیں مجروحِ الفت فکرِ درماں میں
یہ زخمی آپ کر لیتے ہیں پیدا اپنے مرہم کو

محبّت کے شرر سے دل سراپا نور ہوتا ہے
ذرا سے بیج سے پیدا ریاضِ طور ہوتا ہے

دوا ہر زخم کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا
علاجِ زخم ہے آزاد احسانِ رفو رہنا

شرابِ بیخودی سے تا فلک پرواز ہے میری
شکستِ رنگ سے سیکھا ہے میں نے بن کے بُو رہنا

تجھے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں
عبادت چشمِ شاعر کی ہے ہر دم باوضو رہنا

بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ! کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا

جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہیے مثلِ حبابِ آب جو رہنا

رہ زرہ اپنوں سے بے پروا اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور ہے دنیا میں او بیگانہ خو رہنا

شرابِ روح پرور ہے محبت نوعِ انساں کی
سکھایا اس نے مجکو مست بے جام و سبو رہنا

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

بیابانِ محبت دشتِ غربت بھی وطن بھی ہے
یہ ویرانہ قفس بھی آشیانہ بھی چمن بھی ہے

محبت ہی وہ منزل ہے کہ منزل بھی ہے صحرا بھی
جرس بھی کارواں بھی راہبر بھی راہزن بھی ہے

مرض کہتے ہیں سب اسکو یہ ہے لیکن مرض ایسا
چھپا جس میں علاجِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

جلانا دل کا ہے گویا سراپا نور ہو جانا
یہ پروانہ جو سوزاں ہو تو شمعِ انجمن بھی ہے

وہی اک حسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں
یہ تیریں بھی ہے گویا بے ستوں بھی کوہکن بھی ہے

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

سکوت آموز طولِ داستانِ درد ہے ورنہ
زباں بھی ہے ہمارے منہ میں او تابِ سخن بھی ہے

"نمی گردید کوتہ رشتۂ سعیے رہا کردم"
حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

سرگزشت آدم

سنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصۂ پیمانِ اوّلیں میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

سنایا ہند میں آکر سرودِ ربانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے

بنایا ذروں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیِ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقلِ دُور بیں میں نے

کیا اسیر شعاؤں کو برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہہ و نگیں میں نے

ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

ترانۂ ہندی

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

گودی میں کھیلتی ہیں اسکی ہزاروں ندیاں
گلشن ہے جن کے دم سے رشکِ جناں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری
صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

اقبال! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

جگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آکے چمکا، گمنام تھا وطن میں

تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا؟
ذرّہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں

حسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے، آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا، جگنو بھی اک پتنگا
وہ روشنی کا طالب، یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانہ کو تپش دی، جگنو کو روشنی دی

رنگیں نوا بنایا مرغانِ بے زباں کو
گل کو زبان دے کر تعلیم خامشی دی

نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی

رنگیں کیا سحر کو، بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی

سایہ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بے کلی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جگنو کا دن وہی ہے جو رات ہے ہماری

حسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ
نغمہ ہے بوئے بلبل، بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی
جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں
ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

کنارِ راوی

سکوتِ شام میں محوِ سرود ہے راوی
نہ پوچھ مجھ سے جو ہے کیفیت مرے دل کی

پیامِ سجدہ کا یہ زیر و بم ہوا مجھ کو
جہاں تمام سوادِ حرم ہوا مجھ کو

سرِ کنارۂ آبِ رواں کھڑا ہوں میں
خبر نہیں مجھے لیکن کہاں کھڑا ہوں میں

شرابِ سرخ سے رنگیں ہوا ہے دامنِ شام
لئے ہے پیرِ فلک دستِ عشوہ دار میں جام

عدم کو قافلۂ روز تیز گام چلا
شفق نہیں ہے، یہ سورج کے پھول ہیں گویا

کھڑے ہیں دور وہ عظمت فزائے تنہائی
منارِ خواب گہِ شہسوارِ چغتائی

فسانۂ ستم انقلاب ہے یہ محل
کوئی زبانِ سلف کی کتاب ہے یہ محل

مقام کیا ہے، سرودِ خموش ہے گویا
شجر؟ یہ انجمنِ بے خروش ہے گویا

رواں ہے سینۂ دریا پہ اک سفینۂ تیز
ہوا ہے موج سے ملاح جس کا گرم ستیز

سبک روی میں ہے مثلِ نگاہ یہ کشتی
نکل کے حلقۂ حدِّ نظر سے دور گئی

جہازِ زندگیٔ آدمی رواں ہے یونہیں
ابد کے بحر میں پیدا یونہیں نہاں ہے یونہیں

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

نانک

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمعِ حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارشِ رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لئے ہندوستاں غم خانہ ہے
دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
بتکدہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نورِ ابراہیمؑ سے آذر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
زناریِ برگساں نہ ہوتا

ہیگل کا صدف گہر سے خالی
ہے اس کا طلسم سب خیالی

محکم کیسے ہو زندگانی؟
کس طرح خودی ہو لازمانی؟

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق
مومن کی اذاں ندائے آفاق

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی

تو سیدِ ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد

ہے فلسفہ میرے آب و گل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

اقبالؔ اگرچہ بے ہنر ہے
اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز
سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز

انجامِ خرد ہے بے حضوری
ہے فلسفۂ زندگی سے دوری

افکار کے نغمہ ہائے بے صوت
ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم
دیں سرِّ محمدؐ و ابراہیمؑ

دل در سخنِ محمدیؐ بند
اے پورِ علیؓ ز بوعلی چند

چوں دیدۂ راہ بیں نداری
قایدِ قرشیؓ بہ از بخاریؒ

۱؎ فارسی اشعار حکیم خاقانی کی تحفۃ العراقین سے ہیں۔

علم و عشق

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن! کرمِ کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقامِ صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عشق مکان و مکیں! عشق زمان و زمیں
عشق سراپا یقیں، اور یقیں فتح باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال، لذتِ ساحل حرام
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عشق ہے اُمّ الکتاب

توحید

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام!
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میرِ سپہ تیری سپہ دیکھی ہے
قُل ہُوَ اللہ کی شمشیر سے خالی ہے نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ
وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام!
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

مستیٔ کردار

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال
مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار!
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو
ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

سلطانی ط

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روحِ قرآنی
خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی!
یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کی عیار
اسی مقام سے آدم ہے ظلِ سبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے
کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہانبانی
کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی
مثالِ ماہ چمکتا تھا جس کا داغِ سجود
خرید لی ہے فرنگی نے وہ مسلمانی
ہوا حریفِ مہ و آفتاب تو جس سے
رہی نہ تیرے ستاروں میں وہ درخشانی

ط ریاض منزل بھوپال کی تخلیق

مدنیّتِ اسلام

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایتِ اندیشہ و کمالِ جنوں!

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گو ناگوں!

نہ اس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری
نہ اس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں!

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں

تسلیم و رضا

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا
پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا!

ظلمت کدۂ خاک پہ شاکر نہیں رہتا
ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا

فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہِ عمل بند
مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا!

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے!
اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے!

اے پیرِ حرم

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا

تو ان کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا انھیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ ان کی پریشاں نظری کا

کہہ جاتا ہوں میں زورِ جنوں میں ترے اسرار
مجھ کو بھی صلہ دے مری آشفتہ سری کا

بیداری

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہوگئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے برّندہ و برّاق!
اس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرّہ میں پوشیدہ ہے جو قوتِ اشراق
اس مردِ خدا سے کوئی نسبت نہیں تجھ کو
تو بندۂ آفاق ہے وہ صاحبِ آفاق
تجھ میں ابھی پیدا نہیں ساحل کی طلب بھی
وہ پاکیٔ فطرت سے ہوا محرمِ اعماق!

سُلطان ٹیپو کی وصیت

تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

حکومت[1]

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و مُلّا کو بُری لگتی ہے درویش کی بات
قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات
گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات

---

[1] ریاض منزل، بھوپال

عورت

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منّتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

راز ہے اس کے تپِ غم کا یہی نکتۂ شوق
آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اسکا وجود

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات
گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

دین و ہنر

سرود و شعر و سیاست، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یکدامنہ!
ضمیر بندۂ خاکی سے ہے نمود اِن کی
بلند تر ہے ستاروں سے ان کا کاشانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عینِ حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیرِ فلک امتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

تخلیق

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحر بیکراں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا
خودی کی موت سے مشرق کی سرزمینوں میں
ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا
ہوائے دشت سے بوئے رفاقت آتی ہے
عجب نہیں ہے کہ ہوں میرے ہم عناں پیدا

نگاہ

بہار و قافلۂ لالہ ہائے صحرائی
شباب و مستی و ذوق و سرور و رعنائی!
اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی
یہ بحر! یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماریٔ شب میں
طلوعِ مہر و سکوتِ شہر بینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

شعاعِ اُمّید

(۱) سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام
دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح کبھی شام
مُدّت سے تم آوارہ ہو پہنائے فضا میں
بڑھتی ہی چلی جاتی ہے بے مہریٔ ایّام
نے ریت کے ذرّوں پہ چمکنے میں ہے راحت
نے مثلِ صبا طوفِ گل و لالہ میں آرام
پھر میرے تجلّی کدۂ دل میں سما جاؤ
چھوڑو چمنستان و بیابان و در و بام

(۲) آفاق کے ہر گوشہ سے اٹھتی ہیں شعاعیں
بچھڑے ہوئے خورشید سے ہوتی ہیں ہم آغوش
اک شور ہے مغرب میں اُجالا نہیں ممکن
افرنگ مشینوں کے دھوئیں سے ہے سیہ پوش
مشرق نہیں گو لذّتِ نظّارہ سے محروم
لیکن صفتِ عالمِ لاہوت ہے خاموش
پھر ہم کو اسی سینۂ روشن میں چھپا لے
اے مہرِ جہاں تاب نہ کر ہم کو فراموش

(۳۳) اک شوخ کرن، شوخ مثالِ نگہِ حور
آرام سے فارغ صفتِ جوہرِ سیماب
بولی کہ مجھے رخصتِ تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرّہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پروین ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب!
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غوّاصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب
جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب
بُت خانے کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہِ محراب
مشرق سے ہو بیزار نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر

"اہلِ ہُنر سے"

مہر و مہ و مشتری چند نفس کا فروغ
عشق سے ہے پائیدار تیری خودی کا وجود

تیرے حرم کا ضمیر اسود و احمر سے پاک
ننگ ہے تیرے لئے سرخ و سپید و کبود

تیری خودی کا عیاں معرکۂ ذکر و فکر
تیری خودی کا حضور عالمِ شعر و سرود!

روح اگر ہے تری رنجِ غلامی سے زار
تیرے ہنر کا جہاں دیر و طواف و سجود

اور اگر باخبر اپنی شرافت سے ہو
تیری سپہ انس و جن! تو ہے امیرِ جنود!

جلال و جمال

مرے لئے ہے فقط زورِ حیدری کافی
ترے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
ترا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

شاعر

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے!
شاعر! ترے سینہ میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم
اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے!
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

ابلیس کا فرمان سیاسی فرزندوں کے نام[1]

لاکر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں
زنّاریوں کو دَیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیّلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کو غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو اُن کے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبالؔ کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

---

[1] شیش محل، بھوپال

مسولینی[1]

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں؟
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج؟
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں! تم نے لوٹے تخت و تاج
پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج!

---

[1] شیش محل، بھوپال (۲۲ اگست، ۱۹۳۵ء)

رُوحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ! مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ! ایّام جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
نا پید ترے بحرِ تخیل کے کنارے پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں!
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!

نالندہ ترے عود کا ہر تارِ ازل سے! تو جنسِ محبت کا خریدارِ ازل سے!
تو پیرِ صنم خانۂ اسرارِ ازل سے! محنت کشِ خوں ریز کم آزارِ ازل سے!
ہے راکبِ تقدیر جہاں تیری رضا دیکھ!

جبرئیل و ابلیس

جبرئیل

ہمدم دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو!

جبرئیل

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو!

ابلیس

آہ اے جبرئیل تو واقف نہیں اس راز سے
کر گیا سرمست مجھ کو توڑ کر میرا سبو!
اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالمِ بے کاخ و کو!
جس کی نومیدی سے ہو سوزِ درونِ کائنات

اس کے حق میں تَقْنَطُوْا اچھا ہے یا لَا تَقْنَطُوْا

جبرئیل

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند!
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس

ہے مری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو!
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر!
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے، میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست و پا الیاس بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو!
گر کبھی خلوت میسّر ہو تو پوچھ اللہ سے!
قصۂ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط! اللہ ھُو، اللہ ھُو، اللہ ھُو

مسجدِ قرطبہ

(اسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ، مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات!
تو ہو اگر کم عیار میں ہوں اگر کم عیار
موت ہے تیری برات، موت ہے میری برات
تیرے شب و روز کی اور حقیقت ہے کیا
ایک زمانے کی رَو جس میں نہ دن ہے نہ رات!
آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہُنر
کارِ جہاں بے ثبات، کارِ جہاں بے ثبات

اوّل و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا

ہے مگر اُس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام
تند و سُبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام
عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں، جن کا نہیں کوئی نام!
عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام!
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گل تاب ناک
عشق ہے صہبائے خام عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم عشق امیرِ جنود!
عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

اے حرمِ قرطبہ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود
رنگ ہو یا خشت و سنگ چنگ ہو یا حرف و صوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود!
قطرۂ خونِ جگر سِل کو بنا تا ہے دل
خونِ جگر سے صدا سوز و سرور و سرود!
تیری فضا دل فروز میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور مجھ سے دلوں کی کشود!
عرشِ مُعلّےٰ سے کم سینۂ آدم نہیں
گرچہ کفِ خاک کی حد ہے سپہرِ کبود!
پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میسّر تو کیا
اس کو میسّر نہیں سوز و گدازِ سجود!
کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود لب پہ صلوٰۃ و درود!
شوق مری لے میں ہے، شوق مری نے میں ہے
نغمۂ اللہ ھُو میرے رگ و پے میں ہے

تیرا جلال و جمال مردِ خدا کی دلیل!
وہ بھی جلیل و جمیل تو بھی جلیل و جمیل!
تیری بنا پائیدار تیرے ستوں بے شمار

شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجوم نخیل!
تیرے در و بام پر وادی، ایمن کا نور
تیرا منار بلند جلوہ گہِ جبرئیل
مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِّ کلیم و خلیل
اس کی زمین بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دنیوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اسکے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقیٔ ارباب ذوق، فارس میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اسکی اصیل
مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لا الٰہ
تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش اسکی شبوں کا گداز
اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اسکا شوق اسکا نیاز اسکا ناز
ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اسکے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اسکی نگہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

عشق کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

کعبۂ اربابِ فن! سطوتِ دینِ مبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں
ہے تہ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں
آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم" صاحبِ صدق و یقیں
جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دل فقر ہے شاہی نہیں
جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب

ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں
جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل و گرم اختلاط سادہ و روشن جبیں
آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں!

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

کون سی وادی میں ہے، کونسی منزل میں ہے
عشقِ بلاخیز کا قافلۂ سخت جاں
دیکھ چکا المنی شورشِ اصلاحِ دیں
جس نے نہ چھوڑے کہیں نقشِ کہن کے نشاں!
حرفِ غلط بن گئی عصمتِ پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں!
چشمِ فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا مغربیوں کا جہاں
ملّتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذّتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں!

رُوحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں
دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا
وادیِ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب
سادہ و پُرسوز ہے دُخترِ دہقاں کا گیت
کشتیِ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب
آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے؟
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب
جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
رُوحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر!
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر!

ساقی نامہ

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار
ارم بن گیا دامنِ کوہسار

گل و نرگس و سوسن و نسترن
شہیدِ ازل لالہ خونیں کفن

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی
اٹکتی لچکتی سرکتی ہوئی

اچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مئے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مئے جس نے ہے مستیٔ کائنات

وہ مئے جس میں ہے سوز و سازِ ازل
وہ مئے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

ہوا اس طرح فاش رازِ فرنگ
کہ حیرت میں ہے شیشہ بازِ فرنگ

پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے

دلِ طور سینا و فاراں دو نیم
تجلّی کا پھر منتظر ہے کلیم!

مسلماں ہے توحید میں گرمجوش
مگر دل ابھی تک ہے زنّار پوش

تمدّن تصوّف شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

حقیقت خرافات میں کھو گئی
یہ اُمّت روایات میں کھو گئی

لُبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب

بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں میں اُلجھا ہوا

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پَر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا

خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

ہری شاخِ ملّت ترے نم سے ہے
نفس اس بدن میں ترے دم سے ہے

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ سوزِ صدیقؓ دے

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اسکو سیار کر

بتا مجھ کو اسرارِ مرگِ حیات
کی تیری نگاہوں میں ہے کائنات

مری دیدۂ تر کی بے خوابیاں
مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

مرے نالۂ نیم شب کا نیاز
مری خلوتِ انجمن کا گداز

امنگیں مری آرزوئیں مری
اُمیدیں مری جستجوئیں مری

مری فطرت آئینۂ روزگار
غزالانِ افکار کا مرغزار

مرا دل مری رزم گاہِ حیات
گمانوں کے لشکر یقیں کا ثبات

یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر
اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اُسے"
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اُسے

دمادم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے میں پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

گراں گرچہ ہے صحبتِ آب و گل
خوش آئی اسے محنتِ آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بتخانۂ شش جہات — اسی نے تراشا ہے یہ سومنات
پسند اسکو تکرار کی خو نہیں — کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اسکی بجلی میں تارے میں ہے — یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول — اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اسکی طاقت سے کہسار چور — کہیں اسکے پھندے میں جبریل و حور
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ — لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ

کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات — تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند — سفر اسکو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کیلئے برگ و ساز — سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے — تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے
ہوا جب اسے سامنا موت کا — کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہانِ مکافات میں — رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاقِ دوئی سے بنی زوج زوج — اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے — اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک دمِ یک نفس

زمانہ کہ زنجیرِ ایّام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

ازل اسکے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اسکے پیچھے نہ حد سامنے

زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اسکے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اسکی ضربوں سے ریگِ رواں

سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اسکی تقویم کا راز ہے

کرن چاند میں ہے شرر رنگ میں
یہ بیرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں

اُسے واسطہ کیا کم و بیش سے
نشیب و فراز و پس و پیش سے

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاکِ آدم میں صورت پذیر

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اسکی آب

وہی ناں ہے اس کیلئے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

فرو فالِ محمود سے در گزر
خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر

وہی سجدہ ہے لائقِ اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام

یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت

یہ عالم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش

خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں

تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر
طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر

خودی شیر مولا جہاں اس کا صید
زمیں اسکی صید آسماں اسکا صید

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود

ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تری شوخیِ فکر و کردار کا

یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

تو ہے فاتحِ عالمِ خوب و زشت
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت

حقیقت پہ ہے جامۂ حرف تنگ
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ

فروزاں ہے سینے میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار کہتی ہے بس

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلی بسوزد پرم

ذوق و شوق

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمۂ آفتاب سے نور کی ندّیاں رواں
حسنِ ازل کی ہے نمود چاک ہے پردۂ وجود
دل کے لئے ہزار سوز، ایک نگاہ کا زیاں

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحاب شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ بہ رنگ طیلساں
گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دُھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی طنابِ اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں
آئی صدائے جبرئیل تیرا مقام ہے یہی
اہلِ فراق کے لئے عیشِ دوام ہے یہی
کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات

کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

ذکرِ عرب کے سوز میں فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

آیۂ کائنات کا معنیِ دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

بادِ صبا کی موج سے نشوونمائے خار و خس
میرے نفس کی موج سے نشوونمائے آرزو

خونِ دل و جگر سے ہے میری نوا کی پرورش
ہے رگِ ساز میں رواں صاحبِ ساز کا لہو

فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئے تاب دار را

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب

شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب

تیرہ و تار ہے جہاں گردشِ آفتاب سے
صبحِ زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

تیری نظر میں ہیں تمام میرے گذشتہ روز و شب
مجھ کو خبر نہ تھی کہ ہے علم نخیلِ بے رطب

تازہ مرے ضمیر میں معرکۂ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰؐ، عقل تمام بولہب

گاہ بہ حیلہ می برد، گاہ بہ زور می کشد
عشق کی ابتدا عجب! عشق کی انتہا عجب

عالمِ سوز و ساز میں وصل سے بڑھ کے ہے فراق
وصل میں مرگِ آرزو! ہجر میں لذتِ طلب

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہِ بے ادب

گرمیِ آرزو فراق! شورشِ ہائے و ہو فراق!
موج کی جستجو فراق! قطرہ کی آبرو فراق!

ابوالعلا معری

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معرّی
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گذر اوقات

اک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاعر اسی ترکیب سے ہو مات

یہ خوانِ ترو تازہ معرّی نے جو دیکھا
کہنے لگا وہ صاحبِ غفران و لزومات

اے مرغکِ بے چارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جسکی مکافات؟
افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

ابلیس کی عرض داشت

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے
پرکالۂ آتش ہوئی آدم کی کفِ خاک
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب
دل نزع کی حالت میں خرد پختہ و چالاک

ناپاک جسے کہتی بھی مشرق کی شریعت
مغرب کے فقیہوں کا یہ فتوےٰ ہے کہ ہے پاک
تجھ کو نہیں معلوم کہ حورانِ بہشتی
ویرانیٔ جنّت کے تصوّر سے ہیں غمناک

جمہور کے ابلیس ہیں اربابِ سیاست
مانی نہیں اب میری ضرورت تہہِ افلاک

ہندی مکتب

اقبال! یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال
کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات

آزاد کا ہر لحظہ پیامِ ابدیت
محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگِ مفاجات

آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منوّر
محکوم کا اندیشہ گرفتارِ خرافات

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

محکوم کے حق میں ہے یہی تربیت اچھی
موسیقی و صورت گری و علمِ نباتات

اقبال صدی کے موقع پر
پروفیسر ساحل احمد
کی نئی تصنیف

اقبال اور غزل

(زیر طبع)

دیگر

نئے سال کے آغاز میں

۱۹۷۷ء کا شعری ادب
(ہندوستانی گروپ)

موسم ـ (منی سیریز میں غزلیں)

تہذیب و تنقید ـــــ
(سات طویل مقالوں کی تلخیص)

غزل پس منظر پیش منظر

یہ کتاب غزل کے تمام رنگوں اور طرزوں کا احاطہ کرتی ہے

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی

یہ کتاب عہد جدید کے ادبی اور تنقیدی ذہن کی تربیت کرتی ہے

ڈاکٹر شبیہہ الحسن رضوی

اس کتاب سے غزل کے مطالعہ کی نئی راہیں کھلیں گی

ڈاکٹر شارب ردولوی

اُردو غزل کی تاریخ میں اس کتاب کو ایک کلاسک کا درجہ ملے گا

پروفیسر کرامت علی کرامت

یہ کتاب اپنے تاریخی تسلسل، تجزیاتی انداز اور اسلوب کی تازہ کاری کی وجہ سے ایک دل کش اضافہ ہے

ڈاکٹر عنوان چشتی

مصنف نے گھسی پٹی باتوں پر تکیہ کرنے کے بجائے خاصی تحقیق سے کام لیا ہے

حامدی کشمیری

آج تک ایسا مفصل، اس قدر بسیط اور اتنا متوازن تنقیدی تجزیہ کم ہی کیا گیا ہے

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

کتاب کے ورق ورق سے مصنف کی محنت اور عرق ریزی نمایاں ہے

مظہر امام

جدید غزل کے بارے میں مصنف کی تحریر تعصبات سے پاک ہے

آزاد گلاٹی

غزل شاعری سے متعلق یہ کتاب ایک تاریخی درجہ رکھتی ہے

پریم وار برٹنی

غزل پس منظر پیش منظر بہت عمدہ منظر نامہ ہے

کرشن موہن